معرکۂ انیس و دبیر

ڈاکٹر نیر مسعود

معرکۂ انیس و دبیر

ڈاکٹر نیر مسعود

تاریخ اشاعت	ستمبر ۲۰۰۰ء
تعداد اشاعت	۵۰۰
مقام اشاعت	ماس پرنٹرز، کراچی
صفحات	۲۴۰
قیمت	۱۵۰ روپے
ناشر	محمدی ایجوکیشن اینڈ پبلی کیشن ڈی-۷۷، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی

فہرست

سرِ آغاز

ڈاکٹر نیر مسعود افسانہ نگار کی حیثیت سے معروف مگر محقق کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ دو حیثیت رکھنے والے تمام اہل قلم کی طرح وہ ان میں سے ایک کو فوقیت دیتے ہیں اور اپنا امتیاز جانتے ہیں کبھی یہ فیصلہ متنازعہ بھی ہو جاتا ہے۔

ے فارسی ہیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ

ڈاکٹر نیر مسعود کو تحقیق کی مشعل اپنے نامی پدر گرامی پروفیسر مسعود حسن ادیب سے ملی مرثیے کے ذوق میں ان کی والدہ محترمہ کا بھی حصہ ہے جنھوں نے کلام انیس کو لوری کی طرح ان کی گھٹی میں ڈال دیا تھا۔ مرثیے پر ان کی تحقیق کا آغاز چالیس سال قبل ہو چکا تھا اور ان کے مضامین مثلاً "انیس کے منظر نامے" جستہ جستہ شائع ہو کر بھی ادبی تنقید پر اپنا گہرا نقش چھوڑ چکے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ان کی تحقیق کے بہترین ثمرات میں سے ایک کو یہاں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر نیر مسعود نے اپنے تخلیقی سفر اور اپنی ادبی حیثیتوں کی وضاحت ہادی عسکری کو ۷ دسمبر ۱۹۹۸ء کو لکھنؤ میں انٹرویو دیتے ہوئے ان لفظوں میں کی ہے۔

"اصل میں میرے دو ہی میدان رہے ہیں' تحقیق اور افسانہ' بعض لوگ غالباً" اس کو متضاد سمجھتے ہیں مگر یہ ہیں نہیں' یہ دونوں اصناف ادب ہیں اگر بالکل دو الگ قسم کی چیزوں میں انسان کو دلچسپی ہو سکتی ہے جیسے مرغی پالنے اور افسانے لکھنے سے تو پھر دو اصناف ادب سے کیوں نہیں ہو سکتی۔ افسانے کے قاری

بہت ہیں تحقیق کم لوگ پڑھتے ہیں۔ لہٰذا اس حوالے سے لوگ
زیادہ مانتے ہیں تعارف میں ضمناً" لوگ لکھتے ہیں کہ تحقیق کا کام
بھی کرتا ہوں ابھی افسانوں کی دو کتابوں کا ترجمہ ہوا ہے ظاہر
ہے کہ حیات انیس یا معرکہ انیس و دبیر کا ترجمہ کوئی نہیں کرے
گا مگر میں نے افسانے کے مقابلے میں دس گنا زیادہ تحقیق پر کام
کیا ہے اس کی میں نے پرواہ نہیں کی کہ افسانے سے زیادہ فائدہ
شہرت اور مقبولیت ملی۔"

(بحوالہ سہ ماہی رثائی ادب' کراچی' شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۰۰ء)

فائدے' شہرت اور مقبولیت سے بے نیاز رہ کر جن لکھنے والوں نے اردو مرثیے کی تحقیق و تنقید میں سنجیدہ خیالی کا اعتبار قائم کیا ان میں ڈاکٹر نیر مسعود کا نام یقیناً بہت نمایاں ہے اگرچہ انہوں نے صنف مرثیہ کی تحقیق و تنقید تک خود کو محدود نہیں رکھا لیکن اس حوالے سے انہوں نے جب بھی قلم اٹھایا اور جو بھی لکھا اسے ادب کے مورخین نے بہت اہمیت دی۔ رثائیات کے ذیل میں ان کا سب سے اہم کام "حیات انیس" کی تدوین ہے۔ انیس کے سوانحی حالات' مختلف ادوار حیات' روز و شب' تخلیقی مشاغل اور اسلوب زندگی پر گزشتہ ایک ڈیڑھ صدی میں جتنی بھی تحریریں اور مقالے و مضامین منظر عام پر آئے ہیں ان میں ڈاکٹر نیر مسعود کی کتاب "حیات انیس" تنقیدی ادب میں ایک انتہائی مستند تالیف کی حیثیت سے یاد رکھی جائے گی۔

"معرکہ انیس و دبیر" حیات انیس ہی کا ایک طویل باب ہے جسے علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا جارہا ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود لکھنؤ سے ۳ دسمبر ۱۹۹۸ء کے ایک خط میں راقم السطور کو لکھتے ہیں۔

"کتاب معرکہ انیس و دبیر" اور "مرثیہ خوانی کا فن" میری کتاب
"حیات انیس" کا ایک حصہ ہے اور ان دونوں موضوعات پر
کتاب میں ایک ایک باب ہوگا لیکن تمام و کمال اور من و عن

شامل کرنے میں یہ دونوں باب (قریب ۳۰۰ صفحے) کتاب کا توازن بگاڑ دیں گے اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ کتاب کے ابواب کی صورت میں جو کچھ لکھوں وہ زیادہ تر ان دونوں کتابوں کے حوالے سے لکھوں اس طرح ان طویل تحقیقی بحثوں اور قرائن کی تفصیلات کو کم کیا جاسکے گا اور ان سے برآمد ہونے والے نتائج کو اصل کتاب میں پیش کیا جاسکے گا یہی طریق کار بعض اور موقعوں پر بھی عمل میں لانا ہوگا میں نہیں چاہتا تھا کہ کتاب طول پکڑ کر سات آٹھ سو صفحوں تک پہنچ جائے۔"

"معرکہ انیس و دبیر" کا نام سامنے آتے ہی قاری کا ذہن "موازنہ انیس و دبیر" کی طرف ضرور جاتا ہے۔ لیکن اس "معرکے" کی خوبی یہ ہے کہ یہ "موازنے" کی راہ سے بالکل الگ ایک ایسی راہ کا سفر ہے جس میں اردو کے دو عظیم مرثیہ نگار شعرا کی معرکہ آرائی کے جملہ سماجی و تہذیبی پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود کی یہ کتاب شبلی نعمانی کی کتاب کے تقریباً" ۹۳ برس بعد منظر عام پر آئی ہے "موازنہ انیس و دبیر" بیسویں صدی کے پہلے عشرے (۱۹۰۷ء) میں شائع ہوئی جبکہ معرکہ انیس و دبیر بیسویں صدی کے آخری عشرے کے بالکل آخر (۲۰۰۰ء) میں اشاعت پذیر ہورہی ہے۔ شبلی نے کلام کا موازنہ کیا ہے جبکہ ڈاکٹر نیر مسعود نے کردار و شخصیت کے موازنے کو معرکے کا نام دے کر بہت دبے پاؤں خود کو کسی تقابلی بحث سے نکال لیا ہے انہوں نے تمام شواہد و حوالوں سے ان دونوں شخصیتوں کے سامنے رکھتے ہوئے آئینے ہمارے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ یہ ایک بہت سنجیدہ فکر' معتدل مزاج' بردبار' بامروت مگر فیصلہ کن نتیجے تک پہنچنے والے محقق کی ایک گہری تحقیقی دستاویز ہے۔

میں نے ڈاکٹر نیر مسعود کو ۱۹۸۰ء میں ان کے گھر "ادبستان' لکھنؤ" کے دالان میں

پہلی بار دیکھا۔ حلیم الطبع' شریف النفس' دنیاداری کے حربوں سے لاتعلق' علم دوست' ادب شناس' خدوخال میں پشتینی شرافت کے خطوط' ان سے اور ان کے گھر کی دہلیز سے میں مرعوب ہوتا چلا گیا۔ یہ وہی در و دیوار ہیں جن کے ہر گوشے اور ہر نقش میں پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کی تصویر باتیں کرتی نظر آتی ہے۔ وہ آواز اب بھی سنائی دیتی ہے جو مرثیہ خوانی سے اپنا ادبی نسب باقی رکھے ہوئے ہے وہ آنکھیں اب بھی نظر آتی ہیں جو مرثیے کے ہزاروں قلمی نسخوں میں تیرتی چلی گئی تھیں۔ وہ ہاتھ اب بھی لکھتے محسوس ہوتے ہیں جنھوں نے اودھ کے گوشے گوشے سے مرثیے کے بوسیدہ نسخوں کو یکجا کیا۔

ڈاکٹر نیر مسعود لکھنؤ کی انھی جید ادبی شخصیت اور مرثیے کے معروف محقق پروفیسر مسعود حسن رضوی کے منجھلے صاحبزادے ہیں ۱۶ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں ان کی ولادت ہوئی اسی تہذیبی شہر سے انھوں نے ۱۹۵۷ء میں فارسی ادب میں ایم اے کیا۔ مرزا رجب علی بیگ سرور پر تحقیقی مقالہ لکھ کر الہ آباد یونیورسٹی سے ڈی فل کی سند حاصل کی۔ ڈاکٹریٹ کے لئے ان کا موضوع محمد صوفی مازندانی تھا جس کے دیوان کی ترتیب (فارسی) پر لکھنؤ یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ درس و تدریس سے ان کی وابستگی ۱۹۶۵ء میں ہوئی۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی سے لیکچرار کی حیثیت سے تعلق قائم ہوا۔ مدت ملازمت کی تکمیل پر وہ اس شعبے سے بہ حیثیت ریڈر وابستہ تھے۔ تعبیر غالب اور کافکا کے افسانوں کے ترجموں سے ان کا سفر اب حیات انیس کے تکمیلی مراحل تک پہنچا ہے۔ رثائیات میں ان کی کتابیں اور مقالے مرثیے کی تاریخ میں یادگار حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ فہرست کچھ اس طرح ترتیب پاتی ہے۔

(کتابیں)

۱	دولہا صاحب عروج	۱۹۸۰ء
۲	مرثیہ خوانی کا فن	۱۹۸۹ء' ۱۹۹۰ء

۳	بزم انیس	۱۹۹۰ء
۴	شہادت حسینؑ کی پیشین گوئیاں	۱۹۹۸ء

(مضامین وغیرہ)

۱	جدید مرثیہ	۱۹۶۷ء
۲	میر انیس کی شخصیت	۱۹۷۶ء
۳	مراثی انیس کا تہذیبی پس منظر	۱۹۷۶ء
۴	معرکہ انیس و دبیر	۱۹۷۷ء
۵	مرزا دبیر کا ایک مرثیہ اور میر ضمیر کی اصلاح	۱۹۷۶ء
۶	ایک جدید مرثیے کا تجزیہ	۱۹۷۶ء
۷	میر انیس کی شخصیت اور مزاجی کیفیت	۱۹۷۸ء
۸	میر انیس: کچھ غیر معروف حالات	۱۹۷۹ء
۹	میر انیس کی شعری حرفت	۱۹۷۹ء
۱۰	میر انیس	۱۹۸۰ء
۱۱	"تلاش دبیر" ایک جائزہ	۱۹۸۰ء
۱۲	"عرفان جمیل"	۱۹۸۰ء
۱۳	میر انیس کے منظر نامے	۱۹۸۱ء
۱۴	"اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء" ایک جائزہ	۱۹۸۲ء
۱۵	کلام انیس میں قربانی کا تصور	۱۹۸۲ء
۱۶	اردو مرثیے کی تہذیب	۱۹۸۳ء
۱۷	انیس: ابتدائی دور	۱۹۸۷ء
۱۸	دبیریات سے متعلق نوادر	۱۹۸۸ء
۱۹	مرثیہ خوانی کا فن	۱۹۸۸ء

ڈاکٹر ہلال نقوی

۲۱ جولائی ۲۰۰۰ء

کراچی یونیورسٹی

تمہید

لکھنؤ میں انیس کی ابتدائی مجلسوں کے بیان میں ایک واقعہ یہ بھی ملتا ہے:

"ایک بڑی مجلس میں سارے اعیان و شرفائے شہر کا ایک جم غفیر جمع تھا اور بعض با اختیار خواجہ سرا بھی آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک خواجہ سرا مرزا دبیر مغفور کے حد سے زیادہ دلدادہ تھے، وہ بھی موجود تھے کہ کسی شخص نے جوش میں آکر میر انیس کی تعریف میں یہ کلمہ پکار کر کہہ دیا کہ اس کلام کے آگے مرثیہ کہنا بے حیائی ہے۔ مرثیہ گویوں کو اگر شرم ہے تو چاہیے کہ اپنے مرثیے دریا میں ڈال دیں۔ یہ کلمہ خصوصاً اس خواجہ سرا کو تیر کی طرح لگ گیا۔ پیچ و تاب کھایا کیا۔ جب مجلس ختم ہوئی تو خواجہ سرا نے اس شخص کا ہاتھ پکڑ لیا اور سخت زبانی کے ساتھ رد و بدل ہونے لگی۔ کچھ لوگ جنبہ کش خواجہ سرا کے اور کچھ طرفدار اس شخص کے ہوئے۔ تا دیر یہی رد و بدل رہی۔ صاحب خانہ نے بہ مشکل دونوں کو اس تکرار سے روکا۔ اسی وقت سے اس مخاصمت [معرکہ انیس و دبیر] کی جڑ قائم ہوئی۔ (فکر بلیغ ۲۳۵)

سعادت خاں ناصر اپنا چشم دید واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"مولف تذکرہ ہذا ماہ صیام میں ایک روز واسطے نماز جماعت کے مسجد میاں تحسین علی خاں (لکھنؤ) میں گیا۔ اتفاقاً نماز اور وعظ تو ہو گئے تھے۔ الا قریب پان سو مومنین کے مسجد ذکور میں جمع تھے۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میر انیس صاحب اور مرزا دبیر صاحب کے شاگردوں میں

بحث ہو رہی ہے۔ نوبت گالی گلوچ اور جوتے پیزار کی پہنچی۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ یہ قصہ کیا ہے؟ ان صاحب نے ہنس کے یہ شعر پڑھا:

قصہ عمر کا ہے نہ جناب امیر کا　　بس جھگڑا رہ گیا انیس و دبیر کا

(خوش معرکہ زیبا ص ۳۰۵)

یہ شعر، جو معرکہ انیس و دبیر کے سلسلے میں بہت مشہور ہوا، دبیر کے شاگرد شیخ گوہر علی مشیر کا ہے۔ علامہ کنتوری اور ثاقب کے مطابق اس کی اصل شکل یہ ہے:

جھگڑا بکر کا ہے نہ جناب امیر کا　　اب قصہ رہ گیا ہے انیس و دبیر کا

(لائف ص ۱۷۴، مقدمہ سبع مثانی ص ۳۷)

بہر صورت اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس معرکے نے قریب قریب مذہبی نزاع کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

لکھنؤ میں ہزاروں کے مجمع کی عزائی مجلسوں سے ابھرنے والے اس معرکے نے پورے پورے قصبوں اور شہروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور اس کے اثرات بہار اور دکن تک پہنچے ہوئے تھے۔ یہ اثرات فوجداریوں، زبانی مباحثوں، شاعرانہ نوک جھونک اور تنقیدی تحریروں کی صورت میں ستر اسی سال تک ظہور کرتے رہے۔ اپنے زمانی اور مکانی پھیلاؤ، شریک حریفوں کی کثرت تعداد اور ان کی انتہا پسندی کے لحاظ سے یہ اردو ادب کی تاریخ کا سب سے بڑا معرکہ تھا، اس لئے اس معرکے کو مختلف پہلوؤں سے دیکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

معرکہ انیس و دبیر کے موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھوانے اور شائع کرنے میں برادر عزیز جناب ہادی عسکری ڈائریکٹر محمدی ایجوکیشن اینڈ پبلیکیشن، کراچی، نے جو دلچسپی دکھائی اسے اس کتاب کا سبب تالیف سمجھنا چاہیے۔ ان کا ادارہ اپنی مطبوعات، خصوصاً اپنے سہ ماہی جریدے "رثائی ادب" کے ذریعے علم و ادب کی اہم خدمات انجام دے رہا ہے۔ "رثائی ادب" کے مدیر ڈاکٹر ہلال نقوی اس کتاب کے شریک محرک ہیں۔ میں دونوں حضرات کا ممنون ہوں۔

نیر مسعود

۱۔ معرکے کا پس منظر

انیس اور دبیر دونوں ۱۲۱۸ھ (۱۸۰۳ء) میں پیدا ہوئے لیکن لکھنؤ میں دبیر کو انیس سے پہلے شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ انیس کا تشکیلی دور فیض آباد میں گزرا اور لکھنؤ میں ان کی خوانندگی شروع ہونے سے پہلے دبیر مرثیے کے عناصر اربعہ خلیق، فصیح، دلگیر اور ضمیر کے بعد کی نسل کے سب سے سربرآوردہ مرثیہ گو ہو کر اپنا انفرادی رنگ قائم کر چکے تھے۔ ان کے شاگردوں کا بھی ایک وسیع حلقہ موجود تھا جس میں شاہی خاندان کے افراد بھی شامل تھے۔ اردو مرثیے کو انہوں نے اپنے پیش رووں اور خود اپنے استاد ضمیر سے آگے بڑھا دیا تھا اور نئے مرثیے کے میدان کے بلاشرکت غیرے مالک ہو چکے تھے۔ اس وقت لکھنؤ کے افق پر انیس نمودار ہوئے۔

دبیر نے اپنے ذاتی کمال کے بل بوتے پر اپنا میدان بنایا تھا۔ انیس کے لئے بڑی حد تک بنا بنایا میدان موجود تھا، اس لئے کہ ان کے پس پشت ان کے باپ میر خلیق، دادا میر حسن اور پردادا میر ضاحک کی شہرت تھی جس کی وجہ سے لکھنؤ میں خود کو پہچنوانے کا مسئلہ ان کے لئے وجود نہیں رکھتا تھا۔ خلیق کی وجہ سے آتش، ناسخ، ضمیر اور ان کے حلقوں کے علاوہ بہت سے مقتدر شہری، جن کے یہاں خلیق پڑھتے تھے، انیس کی حوصلہ افزائی کرنے اور ان

کے متعلق عام حسن ظن کو بڑھانے کیلئے موجود تھے اور جب انیس نے لکھنؤ میں پڑھنا شروع کیا تو اس حسن ظن کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔ ان کے گھرانے کی زبان پہلے ہی سے مستند سمجھی جاتی تھی۔ خلیق کو اپنے معاصر مرثیہ گویوں میں اپنی زبان ہی کی بنا پر امتیاز حاصل تھا۔ انیس نے بھی اپنی زبان کے بارے میں دعویٰ کیا، "حقا کہ یہ خلیق کی ہے سر بہ سر زباں"، اور اسی کے ساتھ مضامین نو باندھ باندھ کر دبیر کی طرح مرثیے کو نیا رنگ روپ دینا شروع کیا۔ جلد ہی لکھنؤ میں ان کے مداحوں کا بھی حلقہ بن گیا اور ان کی خوانندگی کے کمال نے اس حلقے کو تیزی کے ساتھ وسیع کیا۔ مرثیہ خوانی کو انیس نے ایک باضابطہ فن بنا دیا تھا۔ آواز کے اتار چڑھاؤ، لہجے کی تبدیلیوں، چشم و ابرو کے اشاروں اور بدن کی خفیف سی جنبشوں سے وہ سننے والوں پر جادو سا کر دیتے تھے اور ان کے کلام کی تاثیر کئی گنا بڑھ جاتی تھی۔ ان کے مقابلے میں دبیر سیدھا سادھا پڑھتے تھے اور پڑھت میں اشاروں سے کام لینے کو مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ جو لوگ دونوں شاعروں کا تنقیدی موازنہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے وہ بھی انیس کی خوانندگی سے متاثر ہو کر ان کو دبیر کے مقابلے میں زیادہ پسند کرنے لگے تھے۔

شروع ہی سے ان دونوں مرثیہ گویوں کا تقابل اور موازنہ ہونے لگنا فطری بات تھی۔ عظیم آباد کے سیاح نجابت حسین خان نے ۲۶ ربیع الاول ۱۲۵۹ھ (۲۷ اپریل ۱۸۴۳ء) کو لکھنؤ کی ایک مجلس میں انیس کو سنا تھا۔ وہ انیس کی تعریف کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اس زمانے میں وہ دبیر کے سوا نظیر نہیں رکھتے، بلکہ خواص تو انہیں مرزا دبیر پر بھی ترجیح دیتے ہیں (سوانح لکھنؤ)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اول اول انیس کو خواص کے نسبتاً محدود حلقے میں دبیر پر ترجیح حاصل تھی اور گویا ان کا اور دبیر کا مقابلہ برابر کا نہیں تھا۔ لیکن دونوں کے درمیان مقابلے کا مسالا بہت موجود تھا، اس لئے کہ واقعہ کربلا دونوں کا مشترک موضوع تھا جس کے مشترک جزئیات کو دونوں اپنے اپنے انداز سے نظم کرتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے ادا کئے ہوئے مضمون کو بہتر ڈھنگ سے ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اصل معرکہ انیس و دبیر تو یہی تھا جس کا میدان دونوں باکمالوں کا کلام تھا۔ اس کلام میں گاہ گاہ

شاعرانہ چشمکیں بھی ہو جاتی تھیں۔ یہ ادبی اور فنی مقابلہ جائے خود ایک بڑے ادبی معرکے کی حیثیت رکھتا تھا جس میں انیسیوں دبیریوں نے بہت شدت اور گرمی پیدا کر دی۔ ان جماعتوں کی معرکہ آرائیاں دیکھنے سے پہلے اس معرکے کو خود انیس و دبیر کے یہاں تلاش کرنا مناسب ہوگا۔

۲۔ انیس و دبیر کا جوابی کلام

افضل حسین ثابت لکھتے ہیں:

"مجھے معمر اور معتبر لکھنؤ کے بزرگوں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اول اول میر صاحب نے مرزا صاحب کے مشہور مرثیوں کے جواب کہے۔ پھر مرزا صاحب نے (جب کہ میر صاحب کی شہرت عہد واجد علی شاہ مرحوم میں ہو گئی تو) میر صاحب کے بعض مرثیوں کے جواب لکھے جن میں سے شاید دو تین مرثیے نکلے ہیں، باقی ایسے مرثیے حسب وصیت جناب مرحوم استاذی مرزا اوج صاحب قبلہ مدظلہ کے پاس محفوظ ہیں۔" (حیات دبیر (۱) ص ۴۹۹)

اس بیان کے برخلاف شاد عظیم آبادی بتاتے ہیں:

"مرزا صاحب کی تو عادت سے یہ تھا کہ خواہ کوئی مضمون ہو، میر انیس یا میر مونس کا شعر سننا شرط تھا۔ حتی الوسع اسی صحبت میں، ورنہ بعد کو، جواب میں شعر کہنا ضرور تھا۔" (فکر بلیغ

ص ۱۷۳)

ثاقب اور شاد دونوں کے بیان اعتدال سے کچھ ہٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ابتدا میں صرف انیس کا دبیر کے مرثیوں کے جواب کہنا اور دبیر کا خاموش رہنا، پھر دبیر کا بھی انیس کے مرثیوں کے جواب کہنے لگنا لیکن انھیں عام نہ کرنا اتنا ہی خلاف قیاس ہے جتنا یہ کہ دبیر انیس یا مونس کا کلام سنتے ہی اس کا جواب کہنے میں لگ جاتے تھے۔

دونوں شاعروں کے یہاں مرثیوں کے موضوع اور بہت سے جزئیات کے اشتراک سے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ انھوں نے متعدد مرثیے ایک دوسرے کے جواب میں کہے ہیں (اور یہ گمان کہیں کہیں صحیح بھی ہو سکتا ہے)، لیکن اس طرح کے مرثیے انیس و دبیر کے تقابلی مطالعے اور موازنے کا موضوع ہیں۔ ہمارے موضوع کا تعلق دونوں کے اس کلام سے ہے جسے پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان میں سے کسی ایک نے دوسرے کے کلام کو پیش نظر رکھ کر اس کے مقابلے پر اور جواب میں کہا ہے۔ اس متقابل کلام میں اکثر جگہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوتا ہے کہ انیس نے دبیر کا جواب کہا ہے یا دبیر نے انیس کا، مثلاً

(دبیر) دریا جو دور پیاس میں تھا شہ کی فوج سے — منہ پر طمانچے مارتا تھا دست موج سے

(انیس) پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی — ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

(دبیر) چاہوں تو بیٹھے بیٹھے اک انگلی سے زین پر — گردوں کی ڈھال چیر کے رکھ دوں زمین پر

(انیس) طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآبؐ کی — رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

(انیس) چلنے میں نیزے کانپتے تھے مثل پائے پیر

(دبیر) تھا نیزوں کو رعشہ قدم پیر کے مانند

(انیس) ہو گیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش

(دبیر) چلائے ہاتھ مل کے جلاجل کہ الاماں

(انیس) ہوتی ہے حلاوت سخن خود ظاہر — کہتی ہے کبھی شکر کہ شیریں ہوں میں

(دبیر) سکتے میں ہے میرے سخن شیریں سے — شکر کا ہے کیا منہ جو کہے شیریں ہوں

دونوں شاعروں کا کچھ متقابل کلام ایسا ہے جس کے بارے میں قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کس نے کس کے جواب میں کہا ہوگا۔ مثلاً انیس کے مرثیے "جب نوجواں پسر شہہ دیں سے جدا ہوا" کا ایک بند ہے:

چرخ و نجوم و شمس و قمر شہر و دشت و در ‏ ‏ سنگ و معادن و صدف و قطرہ و گہر
اشجار و شاخ و برگ و گل و غنچہ و ثمر ‏ ‏ رکن و مقام و باب و منا زمزم و حجر

جن و ملک ہیں انس ہیں غلمان و حور ہیں
کہہ دیں یہ سب کہ ابن علی بے قصور ہیں

مسعود حسن رضوی ادیب لکھتے ہیں:

"اس بند میں انتیس چیزوں کا ذکر اس ترتیب سے کیا گیا ہے کہ ایک ایک طرح کی چیزیں ایک ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں۔ یہ حسن ترتیب کی ایک بے نظیر مثال ہے۔" "(روح انیس" ص ۱۸۹)

دبیر نے اپنے مرثیے "یارب مجھے مرقع خلد بریں دکھا" کے ان دو بندوں میں چھیالیس چیزوں کا ذکر کیا ہے:

باران و قطرہ باغ و گل و معدن و گہر ‏ ‏ صحرا و ذرہ برج و نجوم آتش و شرر
طور و کلیم آب بقا خضر نامور ‏ ‏ ظلمات و نور و شہر و بیابان و دشت و در

قائل ہیں سب کہ ثانی مولا محال ہے
اور ہے تو آئینے میں انھیں کا جمال ہے

نقاش و نقش و کاتب و خط باقی و بقا ‏ ‏ بود و نبود و ذات و صفت ہستی و فنا
آدم ملک زمین فلک گرد کیمیا ‏ ‏ دنیا و دیں حدوث و قدم بندہ و خدا

شاہد ہیں سب کہ صاحب اعجاز ہیں حسینؑ
جاں آفریں کے عاشق جاں باز ہیں حسینؑ

یعنی جو التزام انیس نے ایک بند میں کیا وہ دبیر نے دو بندوں میں کر دکھایا اور اگر انیس نے انتیس چیزوں کا ذکر کیا تو انھوں نے چھیالیس چیزوں کا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دبیر کے

بند انیس کے مقابلے پر کہے گئے ہیں۔ انہوں نے انیس کی نسبتاً چھوٹی فہرست کے مقابلے میں بڑی فہرست پیش کی ہے۔ اگر جواب انیس کی طرف سے ہوتا تو دبیر کے چھیالیس عدد کے مقابلے میں صرف انتیس عدد پیش کر کے رہ جانے اور اس طرح گویا اپنی شکست کا اعتراف کر لینے کے جائے وہ دبیر سے زیادہ طویل فہرست پیش کرتے۔

کچھ ایسی ہی صورت دونوں شاعروں کے بے نقط کلام کی بھی ہے۔ انیس نے ایک مرثیے میں کچھ بند بے نقط کہے ہیں۔ ("وہ طاہر و اطہر ہوا گر معرکہ آرا.....") دبیر نے پورا مرثیہ بے نقط کہہ دیا ("مہر علم سرور اکرم ہوا طالع")۔

دبیر کے ایک مرثیے میں امام حسینؑ ایک شخص کو جو انہیں پہچان نہیں پا رہا ہے، بتاتے ہیں:

مجروح تیغ و خنجر و تیر و سناں ہوں　　اے عاشق حسینؑ میں ہی تو حسینؑ ہوں

انیس کے مرثیے میں ایسے ہی ایک محل پر یہ معروف بیت آتی ہے جو ظاہراً دبیر کی بیت کا جواب ہے:

فرما سکے نہ یہ کہ شہ مشرقین ہوں　　مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

انیس کی مشہور رباعی ہے:

آغوش لحد میں جب کہ سونا ہوگا　　جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہوئے گا انیس　　ہم ہوئیں گے اور قبر کا کونا ہوگا

دبیر کی یہ رباعی اسی رباعی کے جواب میں کہی ہوئی معلوم ہوتی ہے:

اک دن پیوند خاک ہونا ہوگا　　تنہا تنہا لحد میں سونا ہوگا
اس قبر کے پردے کا کھلا حال دبیر　　جو اوڑھنا ہوگا وہ بچھونا ہوگا

اور کہیں کہیں جوابی کلام کو آسانی اور یقین کے ساتھ شناخت کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً انیس نے رباعی کہی:

داغ غم شبہ سینے میں گل بوٹے ہیں　　کیا کیا گہر بیش بہا لوٹے ہیں
مجلس میں ریا سے جو کہ روتے ہیں انیس　　اشک ان کے بھی موتی ہیں مگر جھوٹے ہیں

انیس نے جوہری بن کر جو فیصلہ کیا، دبیر نے سختی کے ساتھ اس کی تردید اس طرح کی:

مجلس میں گل اشک عزا لوٹے ہیں — قامت ہے ولا شیشۂ دل ٹوٹے ہیں
یاں اشک ریائی کا بھی ہے مول بہشت — موتی سچے ہیں جوہری جھوٹے ہیں

انیس نے (بظاہر انتزاع سلطنت اودھ کے بعد) کہا:

افسوس زمانے کا عجب طور ہوا — کیوں چرخ کہن یہ کیا نیا دور ہوا
گردش کب تک نکل چلو جلد انیس — اب یاں کی زمیں اور فلک اور ہوا

دبیر نے دور کی تبدیلی کو اس طرح دیکھا:

کس عہد میں تبدیل نہیں دور ہوا — گہ عدل گئے ظلم گئے جور ہوا
اللہ وہی ہے تو نہ مضطر ہو دبیر — کیا غم جو زمیں اور فلک اور ہوا

دونوں شاعروں کے متقابل کلام پر غور کرنے سے پہلے کچھ اور مثالیں دیکھیے:

(انیس)

برچھی آکر کوئی پہلو پہ لگا جاتا ہے — مارتا ہے کوئی نیزہ تو غش آجاتا ہے
بڑھتے ہیں زخم بدن زور گھٹا جاتا ہے — بند آنکھیں ہیں سر پاک جھکا جاتا ہے

(دبیر)

دل کا یہ حال ہے پژمردہ ہوا جاتا ہے — ایک دریا ہے کہ زخموں سے بہا جاتا ہے
ایک دم میں جو کئی بار غش آجاتا ہے — کوئی برچھی کوئی تلوار لگا جاتا ہے

(انیس) قبضہ تو رہا دست جناب شہ دیں میں
اور تا سر و دنبالہ در آئی وہ زمیں میں

(دبیر) قبضہ تو رہا تیغ کا دست شہ دیں میں
پھل جا کے لگا شاخ سرگاو زمیں میں

(انیس) محتاج عصا ہوئے تو پیری نے کہا
چلیے اب چوبدار مرگ آیا ہے

(دبیر) سمجھو نہ عصا سوئے عدم جانے کو
دو پاؤں تو تھے ایک قدم اور ہوا

(انیس) یوں روح کے طائر تن و سر چھوڑ کے بھاگے
جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

(دبیر)

لرزہ کی شکل تھی خم شمشیر سے عیاں
چلتے ہی رن میں بندھ گیا بھونچال کا سماں
یوں جسم رعشہ دار سے جانیں ہوئیں رواں
جیسے مکاں سے زلزلے میں صاحب مکاں

(انیس) میں باعث نغمہ سنجی بلبل ہوں
کھولے نہ کبھی منہ جو زباں بند کروں

(دبیر) خلاق معانی تو سبھی ہیں لیکن
کھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

(دبیر) دانتوں کے تلے بال محاسن کے دبا کے

(انیس) دانتوں میں شجاعان عرب ڈاڑھیاں والے

(دبیر) گردوں گرے چڑھائیں اگر آستین کو
ہم آسماں کی طرح الٹ دیں زمین کو
(انیس) حملہ کریں چڑھا کے اگر آستین کو
ہم آسماں سمیت الٹ دیں زمین کو
(دبیر) مثل تنور گرم تھا پانی میں ہر حباب
ہوتی تھیں بیچ موج پہ مرغابیاں کباب
(انیس) پانی تھا آگ گرمی روز حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی
(دبیر) یہ دھوپ تھی کہ دانے کا چنا محال تھا

دانہ بچا بھی جلنے سے تو خال خال تھا

(انیس) گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

(دبیر) کہتا تھا فرس ڈھونڈھ تو لے کوئی کہاں ہوں
آنکھوں میں تو پھرتا ہوں نگاہوں سے نہاں ہوں

(انیس) مانند تصور کبھی یاں تھا کبھی واں تھا
آنکھوں میں تو پھرتا تھا پہ نظروں سے نہاں تھا

(دبیر) قدغن ہے شاعروں پہ یہ اس کا جہان میں
ساکن حروف آئیں نہ میرے بیان میں

(انیس) اس کی ثنا اگر کوئی لائے زبان پر
ساکن جو حرف ہو وہ نہ آئے زبان پر

(دبیر) ہر جا تھی ہر اک سمت تھی اور پھر نہ کہیں تھی

(انیس) جلوہ ہر اک مقام پہ تھا پھر کہیں نہ تھی

(انیس) اشکوں سے ہو کیوں نہ آبرو آنکھوں کی
بے قدر ہے وہ صدف جو بے گوہر ہے

(دبیر) بے اشک عزا آبروئے چشم ہے خاک
پانی نہ ہو جس میں وہ کنواں اندھا ہے

(انیس) مجھ سا نہیں عالم میں گنہگار اگر
تجھ سا بھی تو اور کوئی غفار نہیں

(دبیر) گر خوف برابری نہ ہو صاف کہوں
مجھ سا عاصی خدا سا غفار نہیں

(انیس) حقا کہ ملک نواز ہے ذات تری

جنت انھیں اشکوں کے بہانے سے ملی

(دبیر) ہر چشم کے چشمے سے یہ جاری ہے صدا
کوثر مردم کو اس بہانے سے ملا

(انیس) کیونکر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر
میں نے بھی تو جان دے کے پایا ہے تجھے

(دبیر) اے قبر کہاں کہاں نہ کی تیری تلاش
جب خاک میں مل گئے تو پایا تجھ کو

(انیس) کہتے ہیں زبان حال سے موئے سپید
ہے صبح اجل کوچ کی تیاری کر

(دبیر) بالوں کی سیاہی پہ سپیدی آئی
لے صبح ہوئی کوچ کی تیاری کر

(انیس) گلزار جہاں میں سرفرازی پائی
یہ پھل مجھے نخل خاکساری سے ملا

(دبیر) دی ہے جو خدا نے سرفرازی مجھ کو
ثمرہ یہ نہال خاکساری کا ہے

(انیس) وہ نظم پڑھوں کہ بزم رنگیں ہو جائے
اک نعرہ آفرین و تحسیں ہو جائے
جھڑتے ہیں دہن سے پھول لفظوں کے عوض
یاں آئے سخن چیں بھی تو گلچیں ہو جائے

(دبیر) ہاں بلبل سدرہ شور تحسیں ہو جائے
وہ نظم پڑھوں کہ بزم رنگیں ہو جائے
پھل نکلے ہیں پھول لفظ طوبیٰ مصرعے
فردوسی اگر آئے تو گلچیں ہو جائے

دونوں شاعروں کا بیشتر مقابلے کا کلام رباعیوں کی صورت میں ملتا ہے۔ مرثیوں میں زیادہ تر

متفرق بند یا مصرعے جواب میں کہے گئے ہیں۔ کچھ مرثیے بھی جیسا کہ ان کے مطلعوں سے اندازہ ہوتا ہے، ایک نے دوسرے سے تحریک پاکر کہے ہیں، مثلاً

(دبیر) وہ درد ہے کیا درد کہ درماں نہیں رکھتا (دفتر ماتم ۶)

(انیس) کیا زخم ہے وہ زخم کہ مرہم نہیں جس کا (نظامی ۱)

(دبیر) جواں پسر کا الٰہی پدر کو داغ نہ ہو (دفتر ماتم ۱۱)

(انیس) دشمن کو بھی خدا نہ دکھائے پسر کا داغ (گنج گہر ۳)

(انیس) دشمن کو بھی دنیا میں نہ اولاد کا غم ہو (جلد ششم)

(دبیر) دنیا میں برادر نہ برادر سے جدا ہو (دفتر ماتم ۱۴)

(انیس) یارب جہاں میں بھائی سے بھائی جدا نہ ہو (نظامی ۳)

(دبیر) جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہ شبیرؑ (دفتر ماتم ۱۲)

(انیس) جب قتل ہوا ظہر تک اسلام کا لشکر (جلد پنجم جدید)

(دبیر) جب لالہ شفق نے دکھائی بہار صبح (باقیات دبیر)

(انیس) پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح (نظامی ۲)

دبیر کے ایک مرثیے کا مطلع ہے:

دست خدا کا قوت بازو حسینؑ ہے (نول کشور ۱)

اسی ردیف کے ساتھ انیس نے کہا:

شمشاد بوستان رسالت حسینؑ ہے (گنج گہر ۴)

اور اسی ردیف "حسینؑ ہے" میں قافیے بدل بدل کے چھ مطلعے کہے۔ دبیر نے اسی ردیف کے ساتھ ایک اور مرثیہ کہا:

حرز گلوے مصحف یزداں حسینؑ ہے (دفتر ماتم ۷)

اس مرثیے میں مختلف قافیوں کے ساتھ اسی ردیف میں سترہ مطلعے ہیں۔ جواب اور جواب الجواب کے تیور ظاہر ہیں۔ ملتے جلتے مطلعوں والے مرثیے ایک دوسرے کے مقابلے میں کہے

جاتے تھے لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ ان مرثیوں کے جزئی بندوں یا مصرعوں میں بھی ایک دوسرے کا جواب کہا جائے۔ البتہ مطلعے کے بندوں میں مماثلت ہو سکتی تھی۔ مثلاً مرثیہ "کیا زخم ہے وہ زخم......" اور "وہ درد ہے کیا درد......" میں انیس اور دبیر کئی لاعلاج تکلیفوں کے بارے میں سوال کر کے ان سب کو اولاد کے داغ میں سمیٹ لیتے ہیں۔ انیس کہتے ہیں۔

کیا زخم ہے وہ زخم کہ مرہم نہیں جس کا　　کیا درد ہے جز دل کوئی محرم نہیں جس کا
کیا داغ ہے جلتا کوئی دم کم نہیں جس کا　　کیا غم ہے کہ آخر کبھی ماتم نہیں جس کا

کس داغ میں صدمہ ہے فراقِ تن و جاں کا
وہ داغ ضعیفی میں ہے فرزند جواں کا

دبیر پوچھتے اور بتاتے ہیں:

وہ درد ہے کیا درد کہ درماں نہیں رکھتا　　وہ رنج ہے کیا رنج کہ پایاں نہیں رکھتا
کس زخم کا مرہم دلِ انساں نہیں رکھتا　　کس چاک کا پیوند گریباں نہیں رکھتا

بے صبر جس اندوہ میں ہر ایک بشر ہے
وہ داغِ پسر داغِ پسر داغِ پسر ہے

فنِ مرثیہ خوانی میں انیس کے کمال کا ذکر آ چکا ہے۔ ان کی آواز بہت سریلی اور قدرے باریک تھی جس کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ وہ ان اشاروں سے بھی کام لیتے تھے جن کو مرثیہ خوانی کی اصطلاح میں "بتانا" کہتے ہیں۔ دبیر بتانے کو نامناسب خیال کر کے اس سے اجتناب کرتے تھے۔ ان کی آواز بھی بھاری تھی۔ انیس کے ہوا خواہ، بلکہ عام سامعین بھی، مرثیہ خوانی میں انیس کی برتری کا ذکر کرتے تھے۔ دبیر نے "رباعیوں" میں اس مسئلے کو چھیڑا ہے:

ناحق کا نہ چیخنا نہ چلانا ہے　　بے کار نہ ہر بند پہ بتلانا ہے
ان شہ مرداں کا ثنا خواں ہوں میں　　صد شکر کہ پڑھنا مرا مردانہ ہے

جب شاہِ نجف معین و ناصر ہوئے　　کیوں سب میں نہ ممتاز یہ ذاکر ہوئے
آواز ہو بھاری تو ہو پر بات یہ ہے　　مجلس میں سخن نہ بار خاطر ہوئے

دونوں استادوں کے متقابل کلام سے ان کے شعری رویوں کا کچھ سراغ لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے الگ الگ دونوں کے کلام کا مطالعہ کرنا زیادہ مناسب طریق کار ہو گا۔ معرکے والے کلام کے تقابل سے ایک عمومی بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ انیس جس مضمون کو نسبتاً سادہ انداز میں ادا کرتے ہیں دبیر اس میں شعری تکلفات پیدا کرتے ہیں، مثلاً انیس نے کہا۔

پیاسے رہے آ کے چاہ دنیا پہ انیس نکلا بھی کبھی تو شور پانی نکلا

دبیر نے کہا:

چاہا تھا کہ ہاتھ دھوئیں دنیا سے دبیر اتنا بھی نہ اس کنویں میں پانی نکلا

انیس نے کہا:

عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے دنیا میں ہے سب کچھ مگر انصاف نہیں ہے

دبیر نے جواب میں صورت حال کو دائروی بنا دیا:

انصاف ہو کس طرح کہ دل صاف نہیں ہے دل صاف ہو کس طرح کہ انصاف نہیں ہے

گزشتہ مثالوں میں بھی ہم نے دیکھا کہ دبیر کا مصرع "پھل جا کے لگا شاخ سر گاو زمیں میں" انیس کے "اور تا سر دنبالہ درآئی وہ زمیں میں" سے زیادہ پر تکلف ہے اور انیس نے اگر "اشکوں" اور "بہانے" میں ایک ایہام تناسب رکھا تھا تو دبیر نے "چشم"، "چشمے"، "جاری"، "کوثر"، "مردم"، "بہانے" کے چھ ایہام اور مناسبات رکھ کر دکھا دیے۔

لیکن کہیں کہیں اس کے برعکس بھی ہوا ہے۔ اس لئے کہ دونوں استادوں کو شاعری کے سادہ اور پر تکلف دونوں اسلوبوں میں کمال حاصل تھا۔ جوابی کلام میں اس کی بھی مثالیں ملتی ہیں کہ دبیر نے جس مضمون کو سادگی کے ساتھ باندھا ہے اس کو انیس نے پر تکلف بنا دیا ہے۔ مثلاً دبیر نے کہا:

اس ہند میں طوطی قفس کے مانند خوبی سے زباں کی زندہ در گور ہوں میں

انیس نے اسی "زندہ در گور" کے لئے یہ تکلف کیا:

تن پر یہ پڑی ہے گرد بازار کساد — ہوتا ہے یقیں کہ زندہ درگور ہوں میں

انیس و دبیر کے جوابی کلاموں کے ذیل میں اس شبہے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ کہیں کہیں ایک نے دوسرے پر چوٹ کی ہے۔ مثلاً دبیر کا انیس کے باندھے ہوئے مضمون کو دوسرے رخ سے ادا کرنا انیس کے اس شعر کا محرک معلوم ہوتا ہے۔

مضموں مرے قتل ہو رہے ہیں — بہتا ہے انیس خون انصاف

”مرے خرمن کے خوشہ چینوں“ سے بھی انیس کی مراد دبیر ہو سکتے ہیں۔ ادھر دبیر نے ”شکر خدا کہ سرقے کی حد سے بعید ہوں“ کہنے کے ساتھ یہ بھی کہا:

بڑھتا ہوں صف نظم میں ہٹنا نہیں آتا — سب آتا ہے مضمون الٹنا نہیں آتا

مضمون الٹنے کی عمدہ مثال دونوں استادوں کی یہ رباعیاں ہیں جن میں انھوں نے ایک دوسرے کے برعکس بات کہی ہے:

(دبیر) گنجینہ جسے رب ہدا دیتا ہے — وہ داد عطیہ خدا دیتا ہے
خاموش حبابوں کے ہیں ظرف خالی — دریا میں ہے موتی وہ صدا دیتا ہے

(انیس) رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے — وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی — جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

مقابلے کی صورت حال اور مسابقت کے جذبے کا عمومی اثر دونوں شاعروں کے کلام پر پڑنا ناگزیر تھا۔ انھوں نے اپنے اپنے انفرادی رنگ میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اور خوب سے خوب تر کہنے میں اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے ساتھ ساتھ اپنے مدمقابل کے رنگ کو بھی برت کر دکھایا۔ انیس نے جب لکھنؤ میں پڑھنا شروع کیا اس وقت دبیر کا رنگ جما ہوا تھا۔ انیس کا نیا رنگ سامنے آنے کے بعد فطری بات تھی کہ دبیر بھی اس رنگ میں کہہ کر دکھادیں۔ دوسری طرف انیس کے لئے بھی ضروری تھا کہ گاہ گاہ اپنے کلام میں وہ رنگ پیدا کریں جسے کلام دبیر کا طرہ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں دبیر کے رویے

سے متعلق دو بیان بھی ہمارے پیش نظر ہیں۔ ثامت دبیر کے ایک مرثیے کے کچھ سادہ اور سہل بند نقل کر کے ان پر یہ حاشیہ دیتے ہیں۔

"یہ عجیب و غریب بات ہے۔ ایسے فصیح و سلیس مرثیے مرزا صاحب نے اس زمانے میں اکثر کہے ہیں کہ جب تک میر انیس مرحوم لکھنؤ میں تشریف نہ لائے تھے، نہ مشہور ہوئے تھے۔ پھر وہ مضمون آفرینی و مشکل و دقیق نظم پر متوجہ ہو گئے۔" (حیات دبیر (۱) ص ۳۱۳)

یہ بیان بڑی حد تک درست ہو سکتا ہے، لیکن یہ بات بھی ہمارے ذہن میں رہنا چاہئے کہ ابتدا میں انیس و دبیر دونوں کا کلام نسبتاً سادہ ہوتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ (اور اغلباً ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش میں) دونوں کے یہاں پرکاری بھی آ گئی۔ البتہ اس پرکاری کا انداز دونوں کے یہاں مختلف تھا۔

دبیر کے نامی شاگرد منیر شکوہ آبادی کا بیان اس سلسلے میں دبیر کے ایک غیر متوقع طرز عمل کا اظہار کرتا ہے۔ منیر بتاتے ہیں کہ بعض لفظ ایسے تھے جو انیس مرثیوں میں لاتے تھے مگر دبیر ان کو نظم نہیں کرتے تھے اور یہ لفظ

"اگر کوئی تمام مرثیے مرزا صاحب کے دیکھے گا تو کہیں نہ پائے گا، مگر (اپنے بھائی اور شاگرد) مرزا غلام محمد نظیر مغفور کے مرثیے پر جو مرزا دبیر اصلاح کرتے تھے تو اس میں تتبع و تاسی زبان میر انیس کی بیشتر مرعی رکھتے تھے۔ اگر ان میں ہو تو ہو۔" (سنان دل خراش ص ۲۲۵)

یہ بیان بھی ایک استاد کو دوسرے سے اثر پذیر ظاہر کر رہا ہے۔ اس اثر پذیری نے مقابلے کے جذبے کے ساتھ مل کر نہ صرف ان استادوں کے بلکہ صنف مرثیہ کے معیار کو بلند سے بلند تر کیا اور انیس و دبیر کا یہ ادبی مقابلہ اردو ادب کے حق میں نعمت ثابت ہوا۔

اس مقابلے کو ایک بڑا فائدہ انیسیوں دبیریوں کی معرکہ آرائیوں نے پہنچایا۔ یہ متصادم جماعتیں اپنے اپنے ممدوح کے کلام کی خوبیوں کو نمایاں کرنے میں جتنی سرگرم رہتی

تھیں اتنی ہی فریق مخالف کے ممدوح کے یہاں معائب کی تلاش میں بھی منہمک رہتی تھیں۔ ان استادوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں اور برائے نام خامیاں تک نہ صرف عالم آشکارا کی جاتی تھیں بلکہ طنز و تضحیک کا نشانہ بھی بنتی تھیں۔ ان کے کلام میں زبان اور محاورے کی معمولی سی غلطی، بیان میں ہلکے سے ابتذال، حفظ مراتب میں ذرا سی لغزش اور پہلوئے ذم کے خفیف سے شائبے پر بھی مخالفوں کی تیز نظریں پڑ جاتی تھیں اور ان پر بڑھ چڑھ کر اعتراض ہوتے تھے۔ اس صورت حال کا تقاضا تھا کہ دونوں استاد بہت محتاط اور چوکس ہو کر مرثیہ کہیں اور خود اپنے کلام کو بھی مخالف، بلکہ دشمن، کی نظر سے دیکھیں۔

یہ وہ عوامل تھے جنھوں نے انیس و دبیر کے ذاتی جوہروں کے ساتھ مل کر اردو مرثیے کو ادب عالیہ کی صف میں جگہ دلوا دی۔

۳۔ معرکے میں انیس و دبیر کے شخصی رویے

انیس و دبیر شاعری میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی جتنی بھی کوشش کرتے ہوں اور ان کے حامی آپس میں جس قدر بھی الجھتے ہوں، خود دونوں استادوں میں شخصی طور پر براہ راست کسی تصادم کا سوال نہیں تھا۔ اس بات پر بہت زور دیا جاتا ہے کہ دونوں کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار تھے، دونوں ایک دوسرے کے کمال کے معترف اور قدرداں تھے اور دونوں میں سے کوئی بھی اپنی محفل میں اپنے ادبی حریف کی برائی سننا پسند نہیں کرتا تھا۔ ایک رئیس سید سجاد حسین نے افضل حسین ثابت کو بتایا کہ جب انیس کے فرزند نفیس ضلع مظفر نگر میں مجلس پڑھنے آئے تھے تو

"ایک دن باتوں باتوں میں خود میں نے ان سے پوچھا کہ جیسے میر صاحب و مرزا صاحب کی نسبت باہم اختلاف لوگوں میں ہے، کیا ان دونوں صاحبوں میں کوئی اختلاف تھا یا ایک دوسرے کو کسی دوسری نظر سے دیکھتا تھا؟ تو جواب میں فرمایا کہ میر انیس صاحب کی موجودگی میں ممکن نہ تھا کہ کوئی شخص صراحتاً یا اشارتاً کسی قسم کی تنقیص مرزا دبیر مغفور کی کر سکے، اور ایسا ہی حال جناب مرزا صاحب مغفور کا تھا۔ ان کے یہاں بھی کوئی شخص کوئی کلمہ

نامناسب میر صاحب کی نسبت نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک صاحب کو دوسرے صاحب سے بہت محبت تھی اور قدر کرتے تھے اور ایک صاحب دوسرے صاحب کی نسبت فرماتے تھے کہ ایسا صاحب کمال شاید (ہی) پھر پیدا ہو۔" (حیات دبیر ص ۶۴)

مزاج دہلوی کا بیان ہے:

"انھیں دبیریوں میں خاصے قابل دید مباحثے ہوا کرتے تھے مگر میر انیس یا مرزا دبیر صاحب کی زبان سے کبھی کسی نے کوئی حرف رکیک یا کسی طرح کی مذمت نہیں سنی ...... اگر اتفاقیہ کبھی یہ دونوں صاحب مل جاتے تو نہایت ہی خلق و تپاک اور بشاشت و خندہ پیشانی سے ملتے دیکھے گئے ہیں۔" (تذکرہ میر انیس صاحب ...... ص ۷۔۶)

نومت رائے نظر لکھتے ہیں:

"کمال شاعری کے ساتھ میر انیس میں انصاف پسندی کا جوہر بھی تھا۔ ان میں اور مرزا دبیر میں اگرچہ حریفانہ لاگ تھی اور لڑوانے والوں نے اس لاگ کو انتہائی حد تک پہنچا دیا تھا تاہم مرزا صاحب کے کلام کی وہ نہایت کشادہ دلی سے داد دیتے تھے۔" اور

"میر اور مرزا میں اگرچہ حریفانہ لاگ بے انتہا بڑھ گئی تھی لیکن یہ وہ لوگ تھے جو تہذیب و شائستگی کے لیڈر تھے اور اہل شہر ان سے تہذیب سیکھنے آتے تھے، لہٰذا دونوں میں کبھی ایسی بے لطفی نہیں ہوئی جو خلاف تہذیب ہو ...... شاعرانہ نوک جھونک میں بھی وہ اس کا لحاظ رکھتے تھے، چنانچہ میر صاحب کے ان اشعار کے جواب میں جو کسی قدر سخت اور اشتعال انگیز ہیں، مرزا صاحب نے نہایت نرم جواب دیے ہیں۔" (میر انیس مغفور)

یہ بیان انیس و دبیر کے مثالی تہذیبی رویوں کو پیش کر رہے ہیں اور بڑی حد تک صحیح بھی ہیں۔ دونوں استادوں کا یہ رویہ متوقع بھی تھا۔ گاہ گاہ کی رسمی ملاقاتوں میں اس کا سوال ہی نہیں تھا کہ اودھ کی پر تکلف تہذیب کے یہ نمائندے آپس میں نوک جھونک شروع کر دیں۔ اس کا بھی سوال نہیں تھا کہ اپنی عام صحبتوں میں انیس دبیر کی یا دبیر انیس کی عیب جوئی کریں یا ایک دوسرے پر اپنی فوقیت جتائیں، نہ اس کا سوال تھا کہ ان صحبتوں میں ہر کس و نا کس کو ان کے حریف کی غیبت کرنے کی اجازت ہو۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ادبی حریف ذاتی سطح پر ایک دوسرے کے ساتھ اخلاق و آداب ملحوظ رکھتے ہیں۔

شیخ محمد جان عروج بتاتے ہیں:

"جناب میر صاحب و مرزا صاحب...... ایک دوسرے پر طعنیہ کلمات پسند نہیں فرماتے تھے...... بلکہ جب کوئی ان دونوں صاحبوں کی صحبت میں کسی کے کلام پر ایراد کرتا تھا تو خود جواب شافی دے کر فرماتے تھے کہ ہرگز ان کی غلطی نہیں، تمہارے فہم کا قصور ہے۔"
(تردید موازنہ ص ۲۲)

لیکن ان مثالی رویوں کا بدیہی سبب اپنی تہذیبی اقدار کا پاس تھا۔ انیس کے سلام "سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو" کے قطعے کا ذکر آگے آئے گا۔ اس سلسلے میں جب انیس کے بھائی مونس اور دبیر کے شاگرد مشیر نے کچھ سخت شعر کہہ دیئے تو روایت کے مطابق انیس نے مونس کو دبیر کے پاس اور دبیر نے مشیر کو انیس کے پاس بھیج کر معافی منگوائی۔ اس کا سبب بھی وہی تہذیبی اقدار کا پاس تھا، لیکن مخصوص نجی صحبتوں میں ان استادوں کو حریف کے بالمقابل اپنی تعریف یا اپنے مقابلے میں حریف کے کلام کی تنقیص پسند آنا یا کم از کم ناگوار نہ ہونا فطری بات تھی۔ شاد عظیم آبادی دبیر کی صحبتوں میں شریک رہے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ان صحبتوں میں اگر انیس کے کلام پر کوئی اعتراض ہوتا تو دبیر اس کا "جواب ایسا دیتے تھے کہ مسکت نہ ہوتا تھا۔" اور اس جواب سے "صاف کھلتا تھا کہ حضرت بہ تاویل جواب دے رہے ہیں، مگر اعتراض کو پسند کرتے ہیں۔" اور اگر ان کے سامنے انیس یا مونس کی کچھ برائی کی جاتی

تھی تو وہ "منع نہیں کرتے تھے، مگر تاویل ضرور کرتے تھے۔" (فکر بلیغ ص ۱۴۰ و ۱۴۵)

یہ براہ راست بیان معرکے میں انیس و دبیر کے مخصوص مثالی رویوں کے متعلق عمومی بیانوں سے قدرے مختلف ہے۔ اگرچہ اس سے عروج کے اس بیان کی جزئی تائید بھی ہوتی ہے کہ دونوں استاد اپنی محفل میں اپنے مد مقابل پر وارد کیے جانے والے اعتراضوں کا جواب دیتے تھے، لیکن یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ دبیر کی صحبتوں میں انیس کی تنقیص یک سر ممنوع نہیں ہے، اور ایسا نہیں ہے کہ وہ انیس کی برائی سننے کے قطعاً روادار نہ ہوں، لیکن یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بہ ذات خود اس تنقیص میں شریک ہونے کے بجائے انیس کی حمایت کرتے ہیں، وہ رسمی اور کم زور حمایت ہی سہی۔

دوسرے دست یاب بیانوں کی روشنی میں دبیر ہم کو انیس کے کمال کا کھل کر اعتراف کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک بار ان کے سامنے انیس کے سلام کا یہ شعر پڑھا گیا:

نمود و بود بشر کیا محیط عالم میں　　ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا

تو انھوں نے "بے ساختہ فرمایا کہ سبحان اللہ، میر صاحب آفتاب ہند ہیں۔ جو باتیں ان کے قلم سے نکل جاتی ہیں حق یہ ہے کہ دوسرے کے خیال میں نہیں آتیں۔" (نوائے وطن ص ۴۳)

مزاج دہلوی کا جو بیان اوپر دیا گیا اس میں وہ یہ بھی بتاتے ہیں:

"مرزا صاحب نے بارہا اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا کہ میر صاحب آل رسولؐ اور اولاد بتولؑ ہیں، جیسا کہ وہ اپنے گھر کا حال لکھ سکتے ہیں، ویسا دوسرا نہیں لکھ سکتا۔"

نظر بھی اپنے محولہ بالا بیان میں بتاتے ہیں۔

"خصوصاً مرزا دبیر میر انیس کا بہ درجہ اتم احترام کرتے تھے اور حاضر و غائب کبھی کوئی کلمہ زبان پر نہیں لائے جو میر صاحب کے خلاف شان ہو۔"

یہ جملہ خود بتا رہا ہے کہ دبیر ادب اور احترام کا رویہ انیس سے زیادہ ملحوظ رکھتے تھے۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انیس کے رویے میں دبیر کا احترام مقابلتاً کم محسوس کیا جاتا تھا۔

دوسرے دست یاب بیانوں میں بھی انیس کا رویہ دبیر سے کچھ مختلف اور کسی حد تک جارحانہ نظر آتا ہے۔ شاد کا یہ بیان قابل غور ہے:

"اگرچہ میر صاحب اپنی عالی دماغی اور بلند حوصلگی سے مرزا صاحب کو اپنا ہم جنب نہ جانتے ہوں لیکن مرزا صاحب اپنی خاکساری سے، میر صاحب پر کیا موقوف ہے، ان لوگوں کو بھی جو ان کے مماثل نہ تھے، اپنا مماثل سمجھتے تھے۔" (نوائے وطن ص ۴۲)

شاد کا بیان کیا ہوا یہ واقعہ بھی قابل غور ہے کہ ایک مرتبہ عظیم آباد میں ایک سید سائل نے انیس کے سامنے ان کی تعریف کرتے ہوئے دبیر کے بارے میں ایک رکیک فقرہ کہہ دیا جسے سن کر انیس برہم ہو گئے۔ انہوں نے کوٹھری سے دو روپے لا کر سائل کے ہاتھ پر رکھے اور کہا:

"سید صاحب، مرزا دبیر مومن اور تمہارے جدؐ کے مدح گو ہیں۔ ایسا کلمہ کہتے ہو! دیکھو پھر کبھی نہ کہنا، خاص کر کے میرے سامنے۔"

اور سائل کے جانے کے بعد یہ بھی کہا:

"صاحب، اچھے پڑھے لکھے بھی اس خوشامد کے مرض میں گرفتار ہیں۔ جانتے ہیں کہ میں خوش ہوں گا، حالانکہ الٹا اثر مجھ پر ہوتا ہے۔ دبیر نے میرا کیا بگاڑا ہے، کیا میرے لئے وہ مرثیہ گوئی ترک کر دیتے؟" (فکر بلیغ ص ۲۵۶)

ظاہر ہے کہ محض خوشامد میں اور خود غرضی کی راہ سے کی ہوئی تعریف یا تنقیص کا ناگوار ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ انیس نے بھی اس پر ناگواری کا اظہار کیا لیکن دبیر کے حق میں صرف یہ کہا کہ وہ صاحب ایمان اور مداح رسولؐ ہیں، اور اس سے بھی بڑھ کر ان کا یہ فقرہ ہے کہ "کیا میرے لئے وہ مرثیہ گوئی ترک کر دیتے"؟ اس میں دبیر کے مقابل اپنی فوقیت کا اظہار نمایاں ہے۔

ایک اور واقعہ یہ ہے کہ انیس کان پور میں معتمد الدولہ آغا میر کے داماد نواب علی حسین خان عرف نواب دولھا کے یہاں مجلس پڑھ کر لکھنؤ واپس ہو رہے تھے۔ روانگی کے وقت،

جب نواب صاحب ان کے امام ضامن باندھ رہے تھے، ایک مصاحب کی تحریک پر انھوں نے دبیر کی اور خود ان کی مرثیہ گوئی کے بارے میں سوال کر دیا۔ انیس نے جواب دیا کہ مرزا دبیر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس فن کو اپنی ذات سے حاصل کیا اور اپنی ہی ذات پر ختم کر دیا۔ میں نے اگر کہا تو کیا کمال کیا کہ یہ میرا خاندانی فن تھا۔ یہ کہ کر سوار ہو گئے (بیان نواب محمد حسین کوثر)۔ یہاں بھی دبیر کی تعریف اس حیثیت سے کی جا رہی ہے کہ خاندانی شاعر نہ ہونے کے باوجود انھوں نے مرثیہ گوئی میں کمال حاصل کیا، مگر یہ کہ پشتینی شاعر کی بات ہی اور ہے۔

اپنے حریف یا اس کے کلام کی تضحیک کی کوئی مثال دبیر کی صحبتوں کے بیانوں میں نہیں ملتی۔ انیس کے یہاں کئی مثالیں مل جاتی ہیں۔ اشرری نے دبیر کے کلام پر انیس کی ایک پھبتی کا یہ واقعہ لکھا ہے:

> "ایک صاحب نے میر انیس سے ذکر کیا کہ مرزا دبیر نے ایک مرثیہ لکھا ہے جس میں اول سے آخر تک کوئی حرف نقطہ دار نہیں آیا ہے۔ میر صاحب مسکرا کر بولے۔ "یہ کہئے سر سے پاؤں تک مہمل ہے۔" جو لوگ جانتے تھے کہ اس صنعت کو صنعت مہملہ کہتے ہیں وہ میر صاحب کے لطف بیان سے محظوظ ہوئے۔"
>
> (حیات انیس ص ۲۵۵)

۱۸۷۱ء میں انیس نواب تہور جنگ کے یہاں مجلسیں پڑھنے حیدرآباد گئے تو ان کی میزبانی اور خاطر مدارات کے فرائض شریف العلما مولوی سید شریف حسین خان کے سپرد ہوئے۔ اس زمانے میں انیس کے حالات اور ان سے ہونے والی گفتگوئیں وہ اپنے بڑے بھائی مولوی سید شریف حسن کے نام خطوں میں لکھتے رہتے تھے۔ ایک خط میں انیس کی صحبتوں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اکثر اوقات تذکرہ مرزا دبیر می آید۔ آں قدر اشعار مہملہ ایشاں می خوانند کہ خارج از بیان

است۔ آں چہ یاد کردہ ام اگر عرض کنم دو خط دیگر بہ اتمام رسیدہ ناتمام ماند۔" (میر انیس کا سفر دکن)

(اکثر اوقات مرزا دبیر کا ذکر آتا ہے۔ (انیس) ان کے مسلسل اشعار اس قدر پڑھتے ہیں کہ بیان سے باہر ہے، میں نے جو (اشعار) یاد کر لئے ہیں اگر عرض کرنے لگوں تو دو اور خط بھر جائیں گے پھر بھی ختم نہ ہوں گے)

یعنی انیس دبیر کے کم زور کلام کے اچھے خاصے حافظ تھے اور نجی صحبتوں میں یہ کلام سنایا کرتے تھے۔

انیس کا حیدرآباد کی سی بڑی سرکار میں بلایا جانا دبیر پر ان کی فوقیت کا ثبوت سمجھا جا سکتا تھا اور لکھنؤ میں غالباً اس کا چرچا ہوا۔ لیکن دبیر کو بھی حیدرآباد بلانے کی سلسلہ جنبانی ہوئی تھی جس کا اظہار انھوں نے ایک رباعی میں کیا۔ انیس نے لکھنؤ سے شریف العلما کو خط کے ذریعے اس کی اطلاع دی اور شریف العلما نے ۱۵ جولائی ۱۸۷۱ء (۲۶ ربیع الثانی ۱۲۸۸ھ) کو اپنے بھائی کے نام خط میں لکھا:

"خط میر انیس صاحب از لکھنؤ رسیدہ...... تحریر فرمودہ اند کہ دریک مجلسے مرزا دبیر صاحب سر منبر خواندند یک رباعی کہ آخر دو مصرعش این است:

آتے ہیں امیروں کے مکرر خط شوق   میری طلبی بھی حیدرآباد میں ہے"

(مکتوب آغا حسین ارسطو جاہی)

(لکھنؤ سے میر انیس صاحب کا خط پہنچا ہے...... تحریر فرمایا ہے کہ ایک مجلس میں مرزا دبیر صاحب نے منبر پر ایک رباعی پڑھی جس کے آخری دو مصرعے یہ ہیں: آتے ہیں امیروں......)

یہاں بھی دبیر سے انیس کا حریفانہ سروکار ظاہر ہو رہا ہے۔

انیس سے منسوب ایک یہ لطیفہ آمیز بیان بھی ملتا ہے۔

"ایک مرثیے میں میں نے ایک بند مقطعے کا دعائیہ نظم کیا تھا جس کا مطلب یہ تھا۔ یا جد،

اپنی مداحی کے صدقے میں آپ مجھے گہر مضمون بیش بہا عطا فرمایا کیجئے۔ دن کو تو یہ نظم کیا، شب کو عالم رویا میں کیا دیکھتا ہوں کہ جناب امام مظلوم علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اے فرزند، تم مجھ سے گہر مضمون بیش بہا کیا مانگتے ہو۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے تمام معدن گہر مضمون کا دبیر کے نام پر ٹھیکا کر دیا ہے۔ اب سوائے دبیر کے کسی کو نہیں مل سکتا۔ تم انہیں کے پاس جاؤ، وہ تم کو تعلیم کر دیں گے۔" (تردید موازنہ ص ۱۶)

"سر سے پاؤں تک مہمل" کی پھبتی کا ذکر آچکا ہے۔ ایک اور واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انیس دبیر کے کلام کے علاوہ خود ان کی شخصیت پر بھی پھبتی کہنے سے نہیں چوکتے تھے۔ دبیر کی رنگت گہری سانولی تھی اور ناک نقشہ بھی زیادہ اچھا نہیں تھا۔ عظیم آباد میں وہ اور انیس...... ان دنوں مجلسیں پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ شاد بیان کرتے ہیں کہ ایک دن انیس

"کوٹھے پر بیٹھے منہ ہاتھ دھو رہے تھے۔ اتنے میں مرزا دبیر مرحوم نواب بہادر مغفور سے ملنے نیچے کے کمرے میں تشریف لائے۔ میر امیر جان مرحوم اور کئی صاحب میر صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ پلٹ کر کہا کہ دیکھنا میر نواب (مونس) حضرت یوسف تشریف لائے ہیں۔ سب اٹھ کر دیکھنے لگے تو مرزا صاحب پر نظر جا پڑی۔ سب مسکرانے لگے۔" (فکر بلیغ ص ۲۷۸)

اور منیر شکوہ آبادی کے اس بیان کی رو سے انیس اپنے کلام پر دبیر کے ایک اعتراض کے جواب میں انہیں چھیڑتے اور چڑاتے نظر آتے ہیں:

"واضح ہو کہ ہمیشہ سے مرزا دبیر اس "بے پر" کی لفظ کو مکروہ طبع اور نامطبوع سمجھے اور کبھی نہیں کہا بلکہ میر انیس پر وہ معترض تھے۔ میر انیس انہیں کی ضد سے ہر مقام میں عمداً لاتے تھے۔" (سنان دل خراش ص ۲۲۵)

میر مظفر حسین، جنہوں نے بچپن میں انیس سے فارسی پڑھی تھی، بتاتے تھے کہ جب وہ دہلی جانے سے پہلے انیس سے ملنے گئے تو

"وہ جناب افسوسناک لہجے میں فرماتے تھے کہ اب تم دہلی جاتے ہو۔ زبان بگڑ جائے گی،

وہی "ورے پرے" تو لنے لگو گے۔" (حیات دبیر ۱۵۳)

انیس کے اس جملے کی زد دبیر پر پڑتی ہے جن کا مصرع ہے "اک سو ورے آیا پرے سے صفت شیر۔"

دبیر بہت حلیم الطبع، منکسر مزاج اور صلح کل انسان تھے اور یہ ان کی شخصیت کے وہ پہلو تھے جن کا اعتراف ان کے حامیوں اور مخالفوں سب کو تھا۔ انیس کی طبیعت میں ایک بانکپن اور اشتعال پذیری تھی اور ان کی آن بان اور نازک مزاجی مشہور تھی۔ مزاجوں کا یہ فرق اپنی مخالف جماعت والوں کے ساتھ دونوں استادوں کے سلوک میں بھی نمایاں تھا۔ دبیر کا ایک واقعہ اس طرح ملتا ہے۔

"ایک صاحب انیسی جماعت کے، نہیں معلوم امتحاناً یا کیوں، مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ فلاں نواب صاحب سے میری ملازمت کی سفارش فرما دیجئے۔ یہ نواب صاحب بھی، جن سے کہ سفارش کی فرمائش کی گئی تھی، انیسی جماعت کے اعلیٰ رکن تھے...... مرزا دبیر صاحب اعلی اللہ مقامہ بھی اس جماعتی فیلنگ...... سے بہ خوبی واقف تھے، مگر...... مرزا صاحب کی زبان سے سوائے "بہتر" کے کچھ نہ نکلا۔ فوراً سوار ہوئے۔ سفارش چاہنے والے صاحب کو ہمراہ لیا اور نواب صاحب کے مکان پر پہنچ گئے۔ نواب صاحب کو مرزا صاحب کے اچانک پہنچ جانے سے بڑا تعجب ہوا اور بعد مزاج پرسی دریافت فرمایا کہ آج کہاں غلام کو سرفراز فرمایا؟

اتنے بڑے ذی کمال کی زبان سے یہ الفاظ سنائی دینا، "اس وقت آپ کے یہاں صرف اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ آپ مجھ کو نوکر رکھ لیں" کچھ آسان اور معمولی بات نہیں ہے مگر مرزا صاحب نے ایک حاجت مند کی حاجت روائی کے لئے یہ الفاظ بہت آسانی سے کہہ ڈالے۔ اسی پر بس نہیں کیا، ایسا کچھ کہا کہ نواب صاحب کو نوکر رکھنا ہی پڑا۔ اور سوائے اس کہنے کے کچھ بن نہیں پڑا کہ میں تو خود حضور کا خادم ہوں، جو حکم ہو بجا لاؤں۔" (وضع داران لکھنؤ ص ۵۱)

ایک اور واقعہ یوں بیان ہوا ہے:

"جناب میر انیس مرحوم کے ایک شاگرد نے (بہ زمانہ شاہی لکھنؤ میں مرزا صاحب سے آکر کہا کہ مجھے ملکہ زمانی کی مجلس میں آج پڑھوا دیجئے۔ فرمایا، بہت اچھا۔ اپنے پاس سے تمام قیمتی شالی کپڑے ان کو پہنوائے۔ ایک پینس میں خود اور دوسری میں ان کو سوار کرا کے ہمراہ لے گئے۔ سلطان عالیہ اور ملکہ زمانی سے تعریف کی اور پڑھوایا۔ وہاں سے دوشالہ اور شالی رومال اور شاید پانچ سو روپے ان کو ملے۔ گھر آکر وہ مرزا صاحب کے شالی کپڑے اتارنے لگے۔ فرمایا، آپ نے شاہزادی کا ہدیہ تو قبول فرمالیا۔ اب یہ فقیر کا ہدیہ کیوں رد فرماتے ہیں۔ ان شالی کپڑوں کے ساتھ دو سو روپے اپنے پاس سے اور دیئے۔" (حیات دبیر ص ۶۸۔۶۷)

میر مونس کے ایک شاگرد کا بیان کیا ہوا یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ ایک سید صاحب کو کربلائے معلی جانے کے لئے دو سو روپے درکار تھے۔ انھوں نے دبیر سے درخواست کی کہ وہ ایک رئیس سے سفارش کر کے، جو انیس سے خصوصیت رکھتے تھے، انھیں مطلوبہ رقم دلوا دیں۔ دبیر نے انھیں ساتھ لیا اور رئیس کے یہاں جاکر سفارش کی۔ رئیس نے دو سو کے بجائے چار سو روپے سید کو دیئے اور کہا:

"میر صاحب، یہ دو سو روپے تو آپ کے مطلوبہ ہیں اور دو سو روپے اس شکریے میں نذر سادات کرتا ہوں کہ جناب مرزا صاحب قبلہ کفش خانے پر تشریف لائے۔" (حیات دبیر ص ۶۹۔۶۸)

یہ روایت بھی ملتی ہے کہ دبیر سے ایک میر صاحب نے بیٹی کی شادی کے لئے ایک رئیس سے مالی امداد کے لئے سفارش کرنے کی درخواست کی۔ وہ رئیس سخت انیسیے تھے اور ان کی محفل میں مسخرے مصاحب دبیر کے طرز خوانندگی کی مضحک نقلیں کیا کرتے تھے۔ دبیر سائل کو لے کر ایسے وقت میں رئیس کے یہاں پہنچے جب وہاں یہی نقلیں ہو رہی تھیں۔ اس غیر ان کی آمد سے متاثر ہو کر رئیس نے سائل کی "اس قدر امداد کی کہ وہ مالا مال ہو گئے۔" (تاریخ لکھنؤ ص ۲۸۷)

سر سید رضا علی "اعمال نامہ" میں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں :

"میر محمد افضل سیتاپور کے رہنے والے تھے۔ غدر کے چند سال بعد مرزا دبیر ایک مجلس پڑھنے سیتاپور گئے۔ میر محمد افضل اس زمانے میں بالکل نوجوان تھے۔ صاحب استعداد ہونے کے ساتھ ساتھ شعر و سخن کا بھی ذوق تھا۔ مرزا صاحب ان سے مل کر بہت خوش ہوئے اور ازراہ شفقت بزرگانہ فرمایا، میں آپ کو اپنے مرثیے بھیجوں گا۔ جس مجلس میں چاہنا پڑھنا۔ میر محمد افضل نے کہا میرے پاس انیس کے ڈھیروں مرثیے ہیں۔ میں انیسیہ ہوں اور میر انیس کے سوا اور کسی کے مرثیے نہیں پڑھتا۔ مرزا صاحب مسکرائے اور فرمایا، ہاں میاں، بڑی اچھی بات ہے کہ آپ میر صاحب کا کلام پڑھتے ہیں۔ وہ اسی مرتبے کے مرثیہ گو ہیں۔ آپ انہیں کا کلام پڑھیں۔" (ص ٦١)

سر رضا علی سے یہ واقعہ میر محمد افضل کے نواسے اخلاق حسین بیرسٹر نے بیان کیا۔ میر محمد افضل نے بعد میں انیس کا تلمذ اور فارغ تخلص اختیار کیا۔ فارغ کے ایک اور نواسے ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری کا بیان ہے کہ اس موقعے پر

"شریک مجلس بزرگوں نے فارغ کو ڈانٹا اور اسی وقت معافی منگوائی۔ مرزا صاحب کا اخلاق تو فرشتوں جیسا تھا، انہوں نے فارغ کو بڑی محبت سے گلے لگالیا۔" (مکتوب)

انیس اور دبیر دونوں کی محفل میں ان پر مخالف جماعت والوں کے اعتراضات کا ذکر آتا تھا۔ شاد بتاتے ہیں کہ دبیر کے سامنے "بعض دریدہ دہن بیہودہ گو دوستی کے پیرائے میں دوسروں کا قول ایسے رکیک لفظوں میں ادا کرتے تھے کہ حلیم سے حلیم کو غصہ آجائے۔ مگر مرزا صاحب صرف "کیا خوب" کہہ کر رہ جاتے تھے" (فکر بلیغ ص ۱۴۵)۔ اس کے برخلاف احسن انیس و دبیر کے معرکوں کے بیان میں بتاتے ہیں کہ کسی نے انیس کے مصرعے "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" پر اعتراض کیا کہ مسافت شب ماہتاب طے کرتا ہے نہ کہ آفتاب۔ اس اعتراض کا ذکر ایک صاحب نے انیس سے کیا تو ان کا "چہرہ سرخ ہو گیا اور دو مرتبہ فرمایا "خیر، دیکھا جائے گا۔" اور پھر خاموش ہو رہے۔" اس کے بعد کی مجلس میں انہوں

نے مرثیہ شروع کرنے سے پہلے اس اعتراض کا تذکرہ کیا اور کہا کہ "میں اس کو مخاطب صحیح نہیں سمجھتا جو ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلتا ہے۔ اگر مرد میدان ہے، بر سر معرکہ اعتراض کرے۔" جواب میں سناٹا رہا۔ انیس کی تالیف قلب کی گئی، "اس پر بھی ان کا جوش کم نہ ہوا جب تک علم ہیئت کے استدلال سے فاصلہ شب میں دورہ شمسی کو ثابت نہ کر دیا۔" (واقعات انیس ص ۴۱۔۴۲)

علامہ غلام حسنین کنتوری ایک یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ مدرسہ ایمانیہ (لکھنؤ) کی جس جماعت کو وہ پڑھاتے تھے اس کے طلبہ انیسیے تھے، صرف ایک طالب علم دبیریہ تھا۔ اس کو انیسیے طلبہ انیس و دبیر کے مقابلے کی بحثیں چھیڑ چھیڑ کر پریشان کیا کرتے تھے۔ ایک دن وہ روتا ہوا علامہ کنتوری کے پاس آیا اور اپنے ہم جماعتوں کی شکایت کرنے لگا۔ علامہ نے ان لڑکوں کو لاجواب کرنے کیلئے اس طالب علم کو انیس کے دو مصرعوں اور ایک شعر پر وارد ہونے والے اعتراض سکھا دیئے۔ طالب علم نے حریفوں کے سامنے یہ اعتراض پیش کر کے "زور شور سے بحث کی۔" "لڑکے ان اعتراضوں کا جواب نہیں دے سکے۔ آخر انیس کے پاس گئے۔" "میر صاحب نے خلق عمیم سے ان کو طلبہ مدرسہ سمجھ کر بلایا اور اپنے پاس بٹھلایا۔ پہلے سے میر صاحب کو ان اطفال کا اپنا معتقد ہونا معلوم تھا۔" طلبہ نے یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کیا۔ "میر صاحب کو ان کا کلام صحیح نہ معلوم ہوا بلکہ الٹا سمجھے کہ یہ لڑکے خود مجھ پر اعتراض کرنے آئے ہیں۔ نہایت برہم ہو کر سب کو اپنے پاس سے دور ہونے کا حکم دیا اور جواب سوال کچھ بھی نہ دیا۔ وہ لڑکے محجوب ہو کر واپس آئے۔" (لائف ص ۱۷۳۔۱۷۵)

انیسیے اور دبیریے فریق ثانی کے ممدوح کی مجلس میں شرکت سے احتراز کرتے تھے اور اگر شریک ہوتے تھے تو تعریف بلکہ بکا کے محل پر بھی خاموش رہتے تھے۔ اتفاقاً اگر کسی مجلس میں ان خلاف سامعین کی اکثریت ہوتی تو مجلس ناکام ہو جانے کا خطرہ رہتا تھا۔ دبیر کو ایک بار ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا جس کا بیان ان کے فرزند مرزا محمد جعفر اوج کی زبانی حسب ذیل ہے:

"ایک مرتبہ بنارس میں ایک ایرانی سوداگر نے مرزا صاحب کے پڑھنے کی مجلس کی تھی۔ کئی ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ اول پیش خوانی میں میں پڑھا۔ مجلس بالکل ٹھس تھی۔ اکثر آدمی صورت دیکھتے ہیں، نہ آہ ہے نہ واہ۔ مجھے سخت تعجب ہوا کہ بظاہر ان میں اکثر پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں مگر ان کے دلوں پر کچھ اثر نہیں، یہ بات کیا ہے۔ میرے بعد جناب مرزا صاحب منبر پر گئے اور خوب جی لگا کر...... مرثیہ ...... پڑھا مگر مجلس گم صم! میں حیرت میں، یا اللہ! یہ بات...... کیا ہے۔ یہاں تک کہ مرزا صاحب نے لڑائی ختم کی۔ اب بین کے موقع پر جب وہ پہنچے تو فرمایا، "اس کا سبب میں سمجھ گیا کہ آپ لوگ کیوں متاثر نہیں ہوتے۔ خیر، اب آپ یہ چند بند بین کے سن لیجئے، اور آپ کو قسم ہے اگر آپ روئے، اور مجھے یہ قسم ہے کہ میں آپ کو رلاؤں۔" یہ کہہ کر جو بین پڑھنا شروع کیا تو ایک کہرام برپا تھا۔ سولہ سترہ آدمیوں کو روتے روتے پیٹتے پیٹتے غش آ گیا۔ بعد ختم مجلس کچھ آدمیوں نے مرزا صاحب سے آ کر عفو تقصیر چاہی اور صاف اقرار کیا کہ ہم میں آپس میں یہ عہد ہو چکا تھا کہ کیسا ہی اچھا کلام کیوں نہ ہو، ہم نہ تعریف کریں گے اور نہ روئیں گے۔ ہمارے دل آپ کی نظم کے مزے اٹھا رہے تھے اور لب گویا سیے ہوئے تھے۔ جب آپ نے بین کے بند پڑھے، دل بے قابو ہو گئے۔ اول آہستہ آہستہ اور پھر بہ آواز بلند ہم روئے۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ میں نے بخشا، مرے خدا نے بخشا، مگر انیسیت و دبیریت کا ایسا خیال ایمان کا بگاڑنے والا ہے۔ آئندہ کے لئے آپ خدا سے توبہ کیجئے اور کبھی کسی ذاکر کے پڑھنے میں ایسا تعصب نہ کیجئے گا"۔ (حیات دبیر ص ۶۰)

اس بیان پر ثاقب کا حاشیہ ہے:

"یہ لوگ پکے انیسیے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر انیس صاحب کو بھی کبھی ایسا موقع پیش آیا تھا، چنانچہ وہ اس کی شکایت ایک مرثیے میں یوں نظم کر گئے ہیں:

خاموش ہیں، گو شیشۂ دل چور ہوئے ہیں　　اشکوں کے ٹپک پڑنے سے مجبور ہوئے ہیں

اس بیت سے پہلے کا مصرع ہے "تعریف خوش الحانی بلبل نہیں کرتے۔" (مراثی انیس ص ۳)

اس طرح کے سامعین سے سابقہ پڑنے پر انیس کا رد عمل کیا ہو سکتا تھا، اس کا اندازہ شاد کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ دبیر کے شاگرد مرزا قدیر عظیم آبادی اپنے استاد کی مجلسوں میں اس طرح داد دیتے تھے جس سے انیس کی منقصت کا پہلو نکلتا تھا، اور جب انیس کی مجلس میں شرکت کرتے تو انیس کی "تعریف کی بھر مار کر دیتے تھے" انیس کو اس طرز عمل کا علم ہوا تو اپنی ایک مجلس میں "ان کی تعریف پر مرثیہ روک کر یہ رباعی پڑھی

نافہم سے کب داد سخن لیتا ہوں ۔۔۔ دشمن ہو کہ دوست سب کی سن لیتا ہوں
چھپتی نہیں بوے دوستان یک رنگ ۔۔۔ کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں

جب تک میر صاحب مرثیہ پڑھتے رہے، یہ گردن جھکائے بیٹھے رہے۔" (فکر بلیغ ص ۲۴۲)

انیس کا مقابلتاً جارحانہ رویہ ظاہر کرنے والے بیانوں کے باوجود یہ سمجھنا مناسب نہ ہوگا کہ وہ دبیر کے بالکل قائل نہیں تھے اور ان کے دل میں اپنے اس زبردست مدمقابل کی کوئی قدر نہیں تھی، بلکہ یہاں تک سمجھنا بھی شاید غلط نہ ہو کہ وہ دبیر کے بہت سے عمدہ کلام کی اسی طرح واقعی قدر کرتے تھے جس طرح ایک باکمال دوسرے باکمال کے فن کی قدر کرتا ہے۔ اور یہ بات دبیر کے علم میں تھی اور شاید یہ بھی وہ سمجھتے تھے، اور بجا طور پر، کہ ان کے کلام کی بعض باریکیوں کو انیس کے سے نکتہ رس اور ماہر فن مرثیہ گو سے زیادہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اسی لئے انیس کی موت کا غم دبیر نے اس وجہ سے بھی کیا کہ ان کا ایک قدر شناس نہیں رہا۔ انیس کی وفات کے پانچ دن بعد اودھ اخبار لکھنؤ کے نامہ نگار نے اس سانحے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا:

"کہتے ہیں کہ حضرت مرزا دبیر سلمہ اللہ تعالیٰ بھی ان کی نعش پر جا کر بہت روئے کہ ایسے معجز بیان، فصیح اللسان، قدردان کے اٹھ جانے سے اب کچھ لطف نہیں رہا۔" (مرگ انیس)

انیس کے بعد دبیر بجھ کر رہ گئے اور

"اس زمانے میں میر صاحب کے کمالات کا اکثر ذکر کر کے فرمایا کرتے تھے کہ اب نہ

پڑھنے کا لطف ہے، نہ کہنے کا مزہ ہے۔ اب ہمیں بھی چراغ سحری سمجھ لو۔ کوئی جھونکا آیا اور خاموش ہو گئے۔" (حیات دبیر ص ۱۰۷)

اپنے باکمال حریف کے بعد سے دبیر کی افسردگی اور مایوسانہ گفتگوؤں کی اتنی شہرت ہو گئی تھی کہ جب انیس کے صرف تین مہینے بعد خود ان کی وفات ہوئی تو اودھ اخبار نے اس کی خبر اس طرح شائع کی:

"شاعر بے نظیر جناب مرزا دبیر نے وقف اندوہ انیس ہو کر شمع ساں اپنے جسم ناتواں کو گھلا دیا اور آخر کار چند روز بے آب و دانہ رہ کر...... اس عندلیب معانی نے گلزار قدس کا رستہ لیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔" (مرگ دبیر)

ایک اور اخبار "نور الانوار" (کان پور) نے لکھا:

"میر انیس صاحب میدان قضا میں جان پر کھیل کر گوے سبقت لے گئے اور مرزا دبیر صاحب کو ان کی مفارقت میں زندگی خوش نہ آئی۔ آخر انھوں نے بھی عالم بقا کو رحلت فرمائی۔"

اور آغا حجو شرف نے ان کی تاریخ وفات کے قطعے میں کہا:

"آخر غم انیس میں بے دم ہوئے دبیر غم ہم صفیر نے یہ کیا ہم صفیر کا"

(دیوان ص ۳۶۴)

انیس کے بعد دبیر نے لکھنؤ میں صرف ایک مجلس پڑھی۔ اس آخری مجلس میں مرثیہ ابھی پورا نہیں سنایا تھا کہ چپ ہو گئے۔ سامعین نے آگے پڑھنے کی درخواست کی تو کہا، "بس، اتنا ہی کہا ہے،" اور مرثیے کا آخری ورق دکھا دیا۔ اس پر کچھ لکھا ہوا نہیں تھا (حیات دبیر (۱) ص ۱۲۹)

مرنے سے پہلے دبیر نے انیس کی وفات کا جو قطعہ تاریخ کہا تھا اس میں یہ مصرع بھی تھا:

الوداع اے ذوق تصنیف، الفراق اے شوق نظم

اور انیس کا سال وفات انھوں نے اس شعر سے نکالا جو انیس کی عظمت کا بہترین اظہار کرتا ہے:

آسماں بے ماہ کامل، سدرہ بے روح الامیں   طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

اس طرح دبیر پر انیس کو یہ فوقیت حاصل ہوئی کہ جیسی شاندار تاریخ وفات ان کی کہی گئی، ویسی دبیر بلکہ شاید اردو فارسی کے کسی بھی شاعر کی نہیں کہی گئی۔ لیکن یہ فوقیت ان کو دبیر ہی نے عطا کی اور یہی تاریخ دبیر کی بھی فتح مبین گئی۔

۴۔ انیسیے دبیریے

دو ہم عصر استادوں کا ایک دوسرے کے مقابلے پر شعر کہنا اور کچھ لوگوں کا ایک کو، کچھ کا دوسرے کو بہتر ٹھہرانا اور اپنے اپنے ممدوح کی حمایت میں فریق ثانی سے بحث مباحثہ کرنا کوئی انوکھی بات نہیں اور ہماری ادبی تاریخوں میں اس قسم کے معرکوں کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، لیکن عموماً ان معرکوں کا موضوع شاعروں کا غزلیہ کلام ہوا کرتا تھا۔ فریقین تک اس کلام کے پہنچنے کا خاص ذریعہ گاہ گاہ ہونے والے مشاعرے تھے، اور ایک ایک مشاعرے میں بیسیوں شاعر یکے بعد دیگرے اپنی ایک ایک دو دو غزلیں پڑھ دیتے تھے۔ لیکن انیس و دبیر کا معاملہ بہت مختلف تھا۔ وہ غزل کے نہیں، مرثیے کے شاعر تھے۔ ان کو مشاعروں میں منجملہ دوسرے شاعروں کے محض بیس بائیس مصرعے کا کلام نہیں سنانا ہوتا تھا بلکہ بہ کثرت ہونے والی ہزاروں کے مجمعے کی مجلسوں میں مرکزی حیثیت سے ہزار بارہ سو مصرعوں تک کے مرثیے پڑھنا ہوتے تھے۔ یہ مرثیے نہ صرف وہ خود مختلف مجلسوں میں بار بار پڑھتے تھے بلکہ ان کے شاگرد اور دوسرے پیشہ ور اور شوقیہ مرثیہ خوان بھی انھیں شہر بہ شہر سیکڑوں مجلسوں میں پڑھ پڑھ کر برسوں تک تازہ رکھتے تھے۔ انیس و دبیر کو اس طرح نہیں سنا جاتا تھا جس طرح مشاعروں کے شاعروں کو سنا جاتا تھا۔ وہ منبر نشین اور ذاکر حسین تھے۔ اہل مجلس ان کے ہاتھ آنکھوں سے لگاتے، جذبات سے مغلوب ہو کر ان کے پیروں پر گر گر پڑتے اور روتے روتے غش کھا جاتے تھے (مرثیہ خوانی کا فن، باب ۷)۔ مرثیہ گوئی کو باعزت پیشہ پہلے بھی سمجھا

جاتا تھا لیکن انیس و دبیر کا جو دبدبہ تھا وہ ان سے پہلے کے مرثیہ گویوں کو حاصل نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے سامعین کو اپنا مداح اور معترف ہی نہیں، عقیدت مند اور قریب قریب مرید بھی بنا لیا تھا۔ مرزا ہادی رسوا انیس و دبیر کے ذکر میں لکھتے ہیں :

"جیسی ان دو شاعروں (کی) تعظیم و توقیر ہوئی، اور شعراء کو نصیب نہ ہوئی ہو گی۔"

(مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات ص ۴۷)

ان مداحوں کی عقیدت مندی کا تقاضا اور اس کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنے ممدوح کی تنقیص اور اس پر دوسرے کی ترجیح کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور تنقیص و ترجیح کا یہ سلسلہ اسی وقت سے شروع ہو گیا تھا جب انیس بھی لکھنؤ کے میدان میں اتر آئے تھے۔ اس کے بعد سے دونوں باکمالوں کے متقابل اور جوابی کلاموں نے سننے والوں کے لئے ان کے موازنے اور مقابلے کی سہولت فراہم کر دی۔ آپس کی چشموں میں موشگافیوں کے لئے ان کو ایک اچھا موضوع ہاتھ آیا اور انیس یا دبیر کی قریب قریب ہر مجلس ان چشموں کے لئے تحریک پیدا کر دیتی تھی۔ رفتہ رفتہ ان چشموں میں گرمی پیدا ہوتی گئی، دونوں کے مداحوں کی جماعتیں بن گئیں اور انہیں انیسیوں دبیریوں کا نام مل گیا۔ "اودھ اخبار" کا نامہ نگار انیس و دبیر کی زندگی میں لکھنؤ کے محرم کا بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"افسوس ہے کہ دونوں نیرین آسمان فصاحت و بلاغت کے تلامذہ و مقلدین نے ترجیح و تفضیل کے باب میں ایسا تعصب اختیار کیا ہے کہ انصاف ہاتھ سے جاتا رہا اور اختلاف اس حالت کو پہنچ گیا کہ گویا انیسیے اور دبیریے دو فرقے ہو گئے ہیں۔" (۱۲ اپریل ۱۸۷۰ء)

یہاں تک کہ لکھنؤ کے باہر بھی جہاں جہاں انیس، دبیر، یا ان کے مرثیے، پہنچے وہاں وہاں انیسیوں دبیریوں کی جماعتیں بن گئیں اور ان کے مابین چھوٹے چھوٹے معرکے گرم ہونے لگے۔

منیر شکوہ آبادی بتاتے ہیں کہ "طرفین کے معتقد، کیا لکھنؤ میں اور کیا لکھنؤ کے باہر" جانبین کے کلام میں عیوب اور غلطیوں کی تاک میں رہتے تھے اور "بارہا معتقدان طرفین میں نوبت تخی و درشتی کی آجاتی تھی،" "حتیٰ کہ ایک فرقہ دبیریہ اور دوسرا انیسیہ" مشہور ہو گیا تھا۔ (سنان دل خراش ص ۱۳۶)

سر سید رضا علی کے نانا میراں برکات حسین (وفات ۱۸۹۶ء)، جو ضبطی اودھ سے پہلے واجد علی شاہ کی فوج میں افسر تھے بتاتے تھے:

"لکھنؤ کی آبادی دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک جماعت انیسیوں کی تھی اور دوسری دبیریوں کی...... دونوں فریقوں کو اپنے اپنے مقتدی کی مدح و ستائش میں اس قدر مبالغہ تھا کہ اگر میر صاحب اور مرزا صاحب ایک ہی مجلس میں اپنا اپنا کلام پڑھتے تو خوں ریزی کی نوبت یقیناً پہنچ جاتی۔" (اعمال نامہ ص ۴۳۔۴۴)

کتاب "وضع داران لکھنؤ" کے مصنف کا بیان ہے:

"چونکہ انیس و دبیر ایک ہی آسمان کے دو ستارے تھے اس لئے طرفین ایک دوسرے کو اپنے اپنے کمالات کی ضو دکھاتے اور مرثیوں میں خوش نما چوٹیں کر جاتے تھے۔ اس شاعرانہ نوک جھونک کا یہ اثر پیدا ہوا کہ ایک دوسرے کے ہوا خواہ آپس میں کچھ اور ہی انداز برتنے لگے۔ ایک جماعت انیسی ہونے پر فخر کرنے لگی تو دوسری دبیری ہونے پر نازاں ہوئی۔ یہ دونوں جماعتیں ہر وقت خانہ جنگی پر تلی رہتی تھیں۔" (ص ۵۱)

قربان علی بیگ سالک اپنی بیاض میں ۱۸۶۱ء کی یادداشت میں لکھتے ہیں:

"میں دو مہینے سے لکھنؤ میں وارد ہوں۔ دلی میں مرزا غالب اور استاد ذوق کی چوٹیں دیکھتا سنتا تھا، مگر یہاں میر انیس اور مرزا دبیر کی معرکہ آرائی کا عالم نرالا ہے۔ ایک طرف کا معتقد دوسری طرف والوں میں ایسے دیکھا جاتا ہے جیسے موحدین میں مشرک اور مسلمانوں میں کافر۔" (حیات انیس ص ۵۴۔۲۵۳)

اگرچہ ایسے غیر جانب دار لوگ کم نہیں تھے جو دونوں استادوں کی مجلسوں میں شرکت

کرتے اور ایک کو دوسرے پر قطعیت اور شدت کے ساتھ ترجیح نہیں دیتے تھے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بھی بہت تھی جو اپنی قوت ممیزہ کے اظہار کے لئے یا خالصتاً ذوق کے تقاضے سے کسی ایک کا جنبہ دار ہونا ضروری خیال کرتے تھے۔ قربان علی بیگ سالک بھی اپنے مندرجہ بالا بیان کے بعد بتاتے ہیں:

"میں نے اپنے آپ کو میر انیس کے طرف داروں میں رکھا ہے۔"

گویا سالک کو بھی اس معرکے میں اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ دبیریوں میں مشرک اور کافر کی طرح دیکھے جانے پر تیار تھے۔

شاد بتاتے ہیں کہ انیس و دبیر کے زمانے میں

"تعصب کا یہ دور دورہ تھا کہ میر انیس کے مداح مرزا صاحب سے اور مرزا صاحب کے مداح میر صاحب سے ملنے تک کو برا سمجھتے تھے۔ میں نے خوب خوب دونوں صاحبوں کی صحبت میں امتیاز کیا کہ اگر اتفاق سے کوئی مخالف جا پڑا ہے تو وہ خود الگ پراگندہ ہو گیا اور صحبت بھر پراگندہ ہو گئی۔" (فکر بلیغ ص ۱۴۵)

انیسیوں دبیریوں کی تفریق لکھنؤ کے باہر تک پہنچ گئی تھی اور مختلف شہر ان فرقوں میں بٹ گئے تھے۔ ۱۸۵۹ء (۱۲۷۵ھ) میں انیس اور دبیر پہلی مرتبہ بنارس پہنچے تو وہاں دونوں سے مجلسیں پڑھوائی گئیں۔ مولوی باقر حسین جون پوری جو ان مجلسوں میں شریک ہوتے تھے بتاتے ہیں:

"بنارس میں پہلے انیسیے اور دبیریے فرقے علیحدہ نہ تھے۔ ان مجلسوں سے دو فرقہ ہو گیا (کذا)۔ ایک دوسرے کی تہجین و تذلیل کرنے لگا۔ وارث علی سوز خواں دبیریے اور سید علی حسن سوز خوان انیسیے ہو گئے۔" (اخبار طریقت)

نادم سیتاپوری کا بیان ہے:

"میری پیدائش سے پہلے سیتاپور بھی "انیسیوں" اور دبیریوں" میں تقسیم ہو چکا تھا۔ "انیسیہ" مکتبہ فکر کے میر کارواں انیس کے نامور شاگرد میر محمد افضل سیتاپوری ...... تھے اور

"دبیریوں" میں میرا خاندان جس کی سربراہی میرے نانا میر ناظر حسین وکیل کے حصے میں آئی..... لکھنؤ کی طرح سیتاپور کے انیسیوں اور دبیریوں میں بھی روایتی اختلافات تھے مگر اتنے شدید نہیں جیسے لکھنؤ میں تھے۔ ہلکی ہلکی چوٹیں بھی ہوا کرتی تھیں مگر حد ادب کے اندر۔" (ماہ نو)

۱۸۷۱ء کے محرم (۱۲۸۸ھ) میں انیس نے حیدرآباد میں مجلسیں پڑھنا شروع کیں تو چوتھی ہی تاریخ کو شریف العلما نے وہاں سے خط میں لکھا:

"سارا شہر مشتاق بلکہ انیسیہ ہو گیا ہے۔" (ہمایوں)

سید خیرات احمد محب نے افضل حسین ثابت کو گیا (بہار) سے خط میں لکھا:

"اس شہر کے جملہ مومنین انیسیے ہیں..... میں پکا اور اول درجے کا انیسیہ ہوں..... ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ میں دبیریہ تھا۔" (حیات دبیر (۲) ص ۴۲۔۴۳)

بنارس کے ایرانی سوداگر کے یہاں دبیر کی مجلس کے بیان میں عرض کیا گیا کہ انیسیے دبیریے ایک دوسرے کے ممدوح کی مجلس میں شرکت سے گریز کرتے تھے اور اگر شرکت کرتے بھی تھے تو خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ "المیزان" میں فوق مہابنی "انیسیوں اور دبیریوں کا شرمناک تعصب" کی سرخی دے کر لکھتے ہیں:

"ایک مجلس میں دوسرے فریق کے لوگ شرکت کرنا جرم خیال کرتے ہیں اور اگر کبھی اتفاقاً شریک بھی ہو جاتے ہیں تو خاموش بت بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ باکمال شاعروں کا دل کش اور جادو اثر کلام ان کے دلوں میں گھر نہیں کر لیتا..... لیکن جوش عصبیت دلوں پر مہر انکار اور زبانوں پر قفل خموشی لگا دیتا ہے۔" (ص ۱۳۔۱۲)

انیس لکھنؤ کے محلہ چوپٹیوں پر دل آرام کی بارہ دری میں مجلس پڑھتے تھے۔ ایک دبیریے اس مجلس میں پہنچ گئے مگر یہ دیکھتے ہی کہ انیس پڑھ رہے ہیں الٹے پاؤں واپس ہو گئے (پورا واقعہ آگے درج ہو گا)۔

ایک دوسرے کے یہاں کی مجلسوں میں خاموش رہنے والی یہ جماعتیں اپنے ممدوح کی

مجلس میں بڑھ بڑھ کر داد دیتی تھیں اور اس میں کبھی کبھی ایسے فقرے بھی بول جاتی تھیں جن سے دوسرے کے ممدوح کی توہین یا تضحیک کا پہلو نکلتا تھا۔ انیس کی ایک مجلس میں پکار کر کہے جانے والے ان فقروں کو نقل کیا جا چکا ہے۔ "اس کلام کے آگے مرثیہ کہنا بے حیائی ہے ......"

انیس کے بھائی مونس کا بیان ہے :

"میں نے دو دفعہ چھپ چھپ کر مرزا دبیر کو سنا، مگر پھر عہد کیا کہ اب فی عمرہ نہ سنوں گا۔"

ان مجلسوں میں سامعین کی تعریفیں طنز آمیز ہوتی تھیں اور انیس نے چھوٹے بھائی کو قسم دے کر آئندہ ان میں شرکت سے روک دیا تھا۔ (فکر بلیغ ص ۲۳۶)

فارغ سیتاپوری کی انیسیت کا ذکر آ چکا ہے کہ انہوں نے دبیر کے مرثیے پڑھنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ میں انیس کے سوا کسی کے مرثیے نہیں پڑھتا۔ سیتاپور ہی کے ایک بزرگ حاجی سلامت علی کا حال نادم سیتاپوری اپنے محولہ بالا مضمون میں بتاتے ہیں کہ وہ

"مرزا صاحب کے ان عقیدت مندوں میں تھے جنھوں نے تمام عمر دبیر کے مرثیوں کے سوا کسی دوسرے مرثیہ گو کے کلام کو ہاتھ نہیں لگایا۔"

انیسیوں دبیریوں کی اپنے اپنے ممدوح سے عقیدت مندی کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ شریف العلما اور ان کے اخلاف زبردست انیسیے تھے۔ شریف العلما کے پوتے سید آغا حسین ارسطو جاہ ایک خط میں لکھتے ہیں :

"اس وقت بھی کم و بیش اٹھاسی برس گزر جانے کے بعد شریف العلما کی عقیدت اور محبت حضرت انیس سے محسوس کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں...... اگر کوئی ہمارے خاندان کا مخالف دبیر کا نام حضرت انیس کے مقابلے میں لے لیتا تھا تو شریف العلما کا رنگ مارے غصے کے سرخ ہو جاتا تھا، اور خاندان میں تو کسی شخص کی یہ مجال نہ تھی کہ ان کے

سامنے حضرت انیس کے علاوہ کسی شاعر کا ذکر کر سکے بلکہ انیس کے مقابلے میں دنیا کے کسی شاعر کا نام لے سکے۔" (بہ نام ادیب)

ارسطو جاہی اسی خط میں خود اپنے متعلق لکھتے ہیں:

"میں انیسیہ ہوں اور انیس کے ساتھ اہل بیتؑ سے کچھ ہی کم محبت ہے۔ ان کے کلام کو جو کچھ جانتا ہوں وہی جانتا ہوں۔ زیادہ منہ نہ کھلوائیں، کہیں میں کافر نہ ہو جاؤں۔" اور

"انیس کی محبت میرے دل میں، بلکہ کل اولاد حضرت شریف العلما کے دل میں، اسی طرح جاری وساری ہے جس طرح اہل بیت (علیہم) السلام کی محبت۔"

اور اپنے چھوٹے بیٹے کے بارے میں بتاتے ہیں:

"اس کا کہنا ہے کہ جو شخص انیس کی شاعری کا مخالف ہو وہ حرام زادہ ہے۔"

جذباتی عقیدت کی یہ شدت کچھ خاندان شریف العلما ہی سے مخصوص نہیں تھی۔ انیسیوں دبیریوں میں بہت ایسے تھے جو اپنے ممدوح کو اگر فوق البشر نہیں تو خدا کے برگزیدوں میں اور کم از کم فن شاعری کی حد تک قریب قریب معصومین کی طرح سہو وخطا سے بالاتر سمجھتے تھے۔ انیس کے ایک عقیدت مند میر حامد علی قمر کے بارے میں یہ بیان ملتا ہے:

"میر انیس کے انتقال کے بہت دن بعد وہ لکھنؤ کے نامی مجتہد شمس العلما مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ کی خدمت میں اکثر جایا کرتے تھے۔ قبلہ وکعبہ کا شباب کا زمانہ تھا اور مرزا دبیر کا کلام پسند خاطر تھا۔ اکثر میر انیس کے کلام پر ایراد فرمایا کرتے تھے اور میر حامد علی ہر اعتراض کا جواب دیتے تھے اور جواب کے ساتھ یہ بھی ضرور کہتے تھے کہ میر انیس سے غلطی ہو ہی نہیں سکتی"۔ (انیسیات ص ۲۶)

اپنے ممدوح سے غلطی سرزد ہونے کے امکان کا بھی انکار کرنا ممدوح کو تقریباً معصومین کی صف میں لے آتا ہے اور یہ ویسی ہی عقیدت ہے جیسی خاندان شریف العلما کے دل میں تھی۔ اور کچھ لوگوں کو انیس سے عقیدت میں یہاں تک غلو تھا کہ منیر شکوہ آبادی ان کو "انیس

کے نصیری" کہہ کر اس جماعت سے تشبیہ دیتے ہیں جو حضرت علیؑ کو خدا مانتی ہے۔

محمد حسین آزاد کی عمر کا آخری حصہ جنون کے عالم میں گزرا۔ میر افضل علی ضو نے خیال ظاہر کیا ہے کہ آزاد نے چونکہ "آب حیات" میں دبیر کا ذکر اچھے لفظوں میں نہیں کیا تھا اس لئے وہ پاگل ہو گئے۔ ضو کے الفاظ ہیں :

"افسوس، ہزار افسوس۔ جناب مولوی محمد حسین صاحب...... مؤلف "آب حیات" کی حیات شریف وشیریں مرض جنوں کے چھینٹوں سے تلخ ہوئی۔ سچ ہے عارفان خدا کو کسی پیرائے میں برا کہنا اچھا نہیں ہوتا۔" (ردالموازنہ ص ۸)

خاندان شریف العلما میں چار پشتوں کی متواتر انیسیت کا حال اوپر گزرا، لیکن ایسی مثالیں بھی بہت تھیں کہ ایک ہی خاندان میں کوئی انیسیہ، کوئی دبیر یہ ہو گیا اور اس سے باہم نااتفاقیاں پیدا ہوئیں۔ مولوی باقر حسین نے بنارس کی تفریق کا جو حال لکھا ہے اس میں سید علی حسن سوز خواں کے انیسیے ہو جانے کے ذکر کے بعد یہ بھی لکھتے ہیں :

"ان کے والد مرحوم سید علی نقی دبیر یئے تھے۔ باپ بیٹوں میں خوب ٹھنی چلی۔"

شاد عظیم آبادی کا گھرانا دبیر کا مداح تھا اور خود شاد کو دبیر کا شاگرد کرادیا گیا تھا لیکن انیس کو سننے کے بعد شاد انیسیے ہو گئے۔ بتاتے ہیں کہ جب وہ انیس کی مجلس سے گھر واپس آئے تو

"میرے آنے کے ساتھ ہی سوال شروع ہو گئے کہ آج تو میر انیس کو تم سن آئے۔ کہو کیسا پایا؟ میں نے بھی بے اختیار کہا کہ دنیا میں نہ پڑھنے میں اپنا جواب رکھتے ہیں نہ کلام میں۔ حضرت عم محترم سخت برہم ہوئے۔ فرمایا کہ کیا لغو بکتا ہے۔ میں ڈر کر خاموش ہو گیا۔" (فکر بلیغ ص ۵۶۔۲۵۵)

انیس و دبیر کے شخصی رویوں کے ذیل میں ہم نے دیکھا کہ انیس کا رویہ مقابلتاً جارحانہ ظاہر ہوتا ہے۔ کچھ یہی رویہ دست یاب بیانوں کی روشنی میں انیسیوں کا بھی ظاہر ہوتا ہے۔ انیس کے شاگرد، ظاہر ہے، انیسیوں کی صف اول میں تھے، سعادت خان ناصر ان کے پندار

اور انانیت کی شکایت کرتے ہیں اور اپنے تذکرے میں انیس کی تعریف کرنے کے ساتھ یہ بھی لکھتے ہیں:

"الاان کے شاگردوں میں نفسانیت بہت ہے کہ قابل بیان نہیں۔" (ص ۳۰۵)

میر عشق کے حال میں ناصر بتاتے ہیں کہ انھوں نے ایک مجلس میں عشق کے کلام کی تعریف کی تو

"میرے جواب میں ایک صاحب، کہ شاگردان میر انیس صاحب سے ہیں، ازراہ نفسانیت بولے...... (کہ عجب نہیں یہ مرثیہ عشق کے خسر ضمیر نے بیٹی کو جہیز میں دیا ہو اور عشق نے اپنا تخلص ڈال کے پڑھ دیا ہو۔) (ص ۵۰۶)

منیر شکوہ آبادی نے انیسیوں کو اپنے جس بیان میں "انیس کے نصیری" کہا ہے اسی میں انھیں "اشخاص ہنگامہ طلب" بھی کہا ہے۔

سید حیدر مہدی شمیم ان "حاشیہ بوسان اریکہ سرکار انیس" کا گلہ کرتے ہیں جو "حضرت دبیر مرحوم کو بہ این الفاظ یاد کرتے ہیں: "وہ تو بکتے تھے"، "سوائے تک بندی کے ان کو آتا ہی کیا تھا۔" یہ مہمل فقرات راقم نے خود سنے ہیں۔" (حیات دبیر (۲) ص ۲۱)

معرکہ انیس و دبیر نے کچھ لطیفوں اور من گھڑت قصوں کو بھی جنم دیا۔ مثلاً سیتاپوری دبیریوں کے سربراہ ناظر سیتاپوری کا یہ لطیفہ ان کے نواسے نادم سیتاپوری نے بیان کیا ہے۔

"نانا صاحب مرزا دبیر کے یہاں تشریف فرما ہیں۔ ایک صاحب دوڑے ہوئے آئے۔ لوگوں نے پوچھا "کدھر سے آرہے ہو؟" جواب دیا، [محذوف] "چوپٹیوں گیا تھا مجلس میں۔ وہاں پہنچا تو قبلہ میر صاحب رونق افروز منبر ہیں۔ صاحب، میں تو ان کی صورت دیکھتے ہی گھر آگیا۔" "اچھا!" نانا صاحب بولے، "تو یہ کہئے وہاں کی مجلس میر صاحب کے ہاتھوں "چوپٹ" ہو رہی ہے۔ ماشاء اللہ" " (ماہ نو)

(میں نے مدتوں پہلے یہ فقرہ کسی بزرگ، شاید نادم مرحوم ہی سے یوں سنا تھا:

"چوپٹیوں کی مجلس "چوپٹ یوں" ہو رہی ہے")

دبیر کے بے نقط مرثیے پر "سر سے پاؤں تک مہمل" کی پھبتی کے علاوہ انیس سے منسوب وہ قصہ بھی پیش کیا جا چکا ہے جس میں دبیر کے نام پر مضامین عالیہ کے ٹھیکے کا ذکر ہے۔ یہ قصہ راوی نے ایک محفل میں یہ کہہ کر سنایا تھا:

"مجھ سے جناب میر انیس صاحب خود فرماتے تھے کہ ایک مرثیے میں..... "الخ

اسی محفل میں ایک اور راوی نے مفتی میر عباس کے دو شاگردوں کا حوالہ دے کر یہ نقل بیان کی:

"ایک مجلس میں مرزا دبیر صاحب جب پڑھ کر منبر سے اترے تو جناب مفتی صاحب اعلی اللہ مقامہ جو کہ اس مجلس میں رونق افروز تھے، مرزا صاحب سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے، ماشاء اللہ مرزا صاحب آپ خوب فرماتے ہیں، مگر اپنا مرثیہ میر انیس کو دکھلا لیا کیجیے تو بہتر ہے۔" (تردید موازنہ ص ۱۵)

مفتی صاحب ہی کی صحبت کا ایک لطیفہ ان کے فرزند سید محمد وزیر کی زبانی یوں نقل ہوا ہے:

"جناب مفتی صاحب کے روبرو ایک انیسیے اور ایک دبیریے جھگڑ رہے تھے۔ ہر شخص اپنے ممدوح کے کلام کو پڑھ کر اس کی خوبیاں بیان کر کے دوسرے پر ترجیح دے رہا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ دبیریے بولے، اور باتیں تو در کنار، ایک تخلص (دبیر) ہی کو دیکھیے، کس قدر عظمت اور برکت نمایاں ہے۔ اس کے وزن پر کس کثرت سے تخلص ہیں اور کس کثرت سے مرزا صاحب کے شاگرد ہیں: مشیر، منیر، مطیر، نظیر، قدیر، ظہیر، فقیر، امیر، وزیر، خبیر، نصیر، صفیر، سفیر، حقیر، صغیر، کبیر وغیرہ وغیرہ۔ وہاں کیا ہے؟ ڈھاک کے تین پات: انیس، نفیس، سلیس۔ آگے بڑھیے تو جلیس۔ مفتی صاحب نے فرمایا، تخلص تو ادھر بھی بہت ہو سکتے ہیں۔ پوچھا گیا؟ فرمایا انیس، بیس، اکیس، بائیس، تیئیس...... اڑتالیس تک۔" (حیات دبیر (۱) ص ۲۲۔ ۲۳)

انیسیوں دبیریوں کی طرف سے من گڑھت کی کارروائیاں فریق مخالف کو قائل کرنے کے لئے دونوں استادوں کے کلام کے نام سے بھی کی جاتی تھیں۔ منیر بتاتے ہیں کہ فریقین "اپنی طرف سے واہی غلط مصرعے گھڑ گھڑ کر مرزا دبیر صاحب و میر انیس صاحب کے ناموں سے مزیت تجیل مخاطب کے واسطے" پڑھا کرتے تھے۔ (سنان دل خراش ص ۱۳۶)

انیسیے دبیریے آپس میں کس طرح کی بحثیں کرتے تھے اور اپنے ممدوح کی تعریف اور فریق کے ممدوح کی تنقیص میں کیا کہتے تھے، اس کی بھی کچھ مثالیں ملتی ہیں۔ منیر کا بیان ہے:

"دبیر والوں کے اعتراض معتقدان انیس کے روبرو یہی سنے گئے کہ "شب کس وجے پر" اور "جاگہ" اور "آتیاں، جاتیاں" اور "گزیل جوان" اور "ہتھیار" کی لفظ کا استعمال و نظائرہا کہنا کیا معنی؟ اور انیس والوں کے اعتراض (کلام دبیر پر) یہ تھے: "دم قدم کی خیر" شہدوں کی زبان ہے، اور "خیر" کا قافیہ "ٹھیر" کرنا، اور "ہند" کو "ہندہ"...... اور "ننگے پاؤں" کے بدلے "ننگے پا" کہہ جانا، علیٰ ہٰذا القیاس" (سنان ص ۷-۱۳۶)۔

انیسیوں دبیریوں کی بحثوں کا جیتا جاگتا مکالماتی بیان "آب حیات" میں ملتا ہے۔ آزاد نے یہ بحثیں غالباً لکھنؤ میں خود سنی تھیں۔ اس بیان میں معرکہ انیس و دبیر کے بیشتر خاص خاص پہلوؤں کا احاطہ ہو گیا ہے۔ آزاد بتاتے ہیں:

"دونوں استادوں کے ساتھ طرف داروں کے دو جتھے ہو گئے۔ ایک انیسیے کہلاتے تھے، دوسرے دبیریے۔ اگرچہ ان کے فضول تحریوں اور اعتراضوں نے بے جا تکراریں اور جھگڑے پیدا کئے مگر بہ نسبت نقصان کے فائدہ زیادہ ہوا کیونکہ بے حد تعریفوں نے دونوں استادوں کے فکروں کو شوق ایجاد اور مشق پرواز میں عرش سے بھی اونچا اچھال دیا۔ دونوں امتیں جو اپنے دعوؤں پر دلیلیں پیش کرتی تھیں کوئی وزن میں زیادہ ہوتی تھی، کوئی مساحت میں، اس لئے یک طرفی فیصلہ نہ ہوتا تھا۔

انیسی امت اپنے سخن آفرین کی صفائی کلام، حسن بیان اور لطف محاورہ پیش کر کے نظیر کی

طلبگار ہوتی تھی۔ دبیر ی امت شوکت الفاظ، بلند پروازی اور تازگی مضمون کو مقابلے میں حاضر کرتی تھی۔

انیسی امت کہتی تھی کہ "جسے تم فخر کا سرمایہ سمجھتے ہو یہ باتیں دربار فصاحت میں نامقبول ہو کر خارج ہو چکی ہیں کہ فقط کوہ کندن اور کاہ بر آوردن ہے۔"

دبیر ی امت کہتی تھی کہ "تم اسے دشواری کہتے ہو، یہ علم کے جوہر ہیں، اسے بلاغت کہتے ہیں۔ تمہارے سخن آفرین کے بازوؤں میں علم کی طاقت ہو تو پہاڑوں کو چیرے اور یہ جواہر نکالے۔ انیس کے کلام میں ہے کیا؟ فقط زبانی باتوں کا جمع خرچ ہے۔"

انیسی امت اس جواب پر چمک اٹھتی تھی اور کہتی تھی۔ "کون سا خیال تمہارے سخن آفریں کا ہے جو ہمارے معنی آفریں کے ہاں نہیں ہے۔ تم نہیں جانتے، جسے باتوں کا جمع خرچ کہتے ہو یہ صفائی اور قدرت بیان کی خوبی ہے، اسے سہل ممتنع کہتے ہیں۔ یہ جوہر خداداد ہے۔ کتابیں پڑھنے اور کاغذ سیاہ کرنے سے نہیں آتا۔"

دبیر یے اس تقریر کو سن کر کسی مرثیے کی تمہید یا میدان کی آمد، یا رجز خوانی کے بند پڑھنے شروع کر دیتے جن میں اکثر آیتوں یا حدیثوں کے فقرے تضمین ہوتے۔

انیسیے کہتے تھے۔ "اس سے کس کافر کو انکار ہے، مگر اتنا ہی پڑھیے گا، آگے نہ بڑھیے گا۔ دوسرے مطلب کی طرف انتقال کیجیے گا تو سلسلے میں ربط بھی نصیب نہ ہو گا۔ حضرت، فقط لفاظی کی دھوم دھام سے کچھ نہیں ہوتا، ادائے مطلب اصل شے ہے۔ اس پر گفتگو کیجیے گا تو پوری بات بھی نہ ہو سکے گی۔ یہ قادر الکلام باکمالوں کا کام ہے۔ جن کو اس فن کے اصول بزرگوں سے سینہ بہ سینہ پہنچے ہیں وہی اس کام کو جانتے ہیں۔"

دبیر یے اس کے جواب میں اپنے سخن آفرین کی آمد طبیعت، مضامین کا وفور، لفظوں کی بہتات دکھاتے تھے اور جا و بے جا کہتے جاتے تھے کہ "دیکھیے، کیا محاورہ ہے، دیکھیے صاف بول چال ہے۔" ساتھ اس کے یہ بھی کہتے تھے کہ "کس کا منہ ہے جو رات کو بیٹھے اور سو بند کہہ کر اٹھے۔ برس دن تک خامہ فرسائی کی اور محرم پر دس پندرہ مرثیے تیار کیے تو کیا کیے۔ وہ بھی دو

اور بھائیوں کے مشورے ملا کر اور مباحثوں کے پسینے بہا کر۔"

انیس کہتے تھے۔ "درست ہے۔ جو رات بھر میں سو بند کہتے ہیں وہ بے ربط اور بے اصول ہی ہوتے ہیں، اور جب ادائے مطلب پر آتے ہیں تو اتنے بھی نہیں رہتے۔" ساتھ اس کے بعض مصرعے بھی پڑھ دیتے تھے جن پر بے محاورہ ہونے کا اعتراض ہوتا تھا، یا تشبیہیں ناقص ہوتی تھیں یا استعارے بے ڈھنگے ہوتے تھے۔

اعتراضوں کی ردوبدل یہاں تک ہوتی تھی کہ دبیر یے کہتے تھے کہ "جو قبولیت خدا نے ہمارے سخن آفرین کو عطا کی ہے کب کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ جس مجلس میں ان کا کلام پڑھا گیا کہرام ہو گیا۔ کیسے غم انگیز اور درد خیز مضامین ہیں۔ ان کے لفظوں کو دیکھو، اعتقاد کے آب حیات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔"

انیے کہتے تھے۔ "وہ کیا پڑھیں گے۔ ان کی آواز تو دیکھئے۔ اور انہیں مرثیہ پڑھنا تو آتا ہی نہیں۔"

غرض جھگڑالو دعوے داروں کو کوئی تقریر خاموش نہ کر سکتی تھی، البتہ مجبوری، کہ دونوں کے گلے تھکا کر آوازیں بند کر دیتی تھی۔" (ص ۳۳-۵۲۱)

آزاد نے اس بحث میں وہ مثالیہ کلام درج نہیں کیا جسے فریقین دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے۔ اس کمی کو افضل حسین ثابت نے کسی حد تک پورا کیا ہے۔ آزاد کی طرح انہوں نے بھی مکالماتی اسلوب اپنایا ہے۔ چند جملے پیش ہیں:

(دبیر یے) "اور سنئے

طرہ وہی ہے سب میں مبیٹر چڑھے جو پھول   بولی وہ عندلیب چمن پرور بتولؑ

مبیٹر مت کا نام ہے۔ شاہزادہ علی اکبر ہم شبیہ پیغمبر کو اس پھول سے تشبیہ دینا جو مت پر چڑھایا جائے، کیا بلاغت اسی میں ہے؟"

(انیے): "جناب، یہ روز مرہ ہے۔ اس میں کوئی برائی نہیں۔ آپ ہی فرمائیے، محاورے میں یونہی بولتے ہیں یا کچھ اور؟"

(دبیر یے): "میر صاحب فرماتے ہیں۔ "کعبے میں غل تھا اشہد ان لا الہ کا۔" یہ تو کلمہ کفر ہو گیا۔ خدا سے انکار نکلتا ہے۔"

(انیس): "خواجہ معین الدین چشتی کی رباعی آپ بھول گئے؟ "حقا کہ بنائے لا الہ است حسین" جس طرح انہوں نے "لا الہ" سے مراد "لا الہ الا اللہ" لی ہے، یہاں بھی وہی صورت ہے۔"

(دبیر یے): "وہ صوفی ہیں، ان کے یہاں جائز ہے۔"

(انیس): "مرزا صاحب فرماتے ہیں، "حسینی علم کی خیر۔" یہ شہدوں کی زبان ہے۔ اس میں ابتذال ہے۔"

(دبیر یے): "فقیروں کی بھی یہی زبان ہے، پھر ابتذال کہاں؟...... البتہ ابتذال اس میں ہے۔ "کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے۔" "چھینٹوں میں آنا شہدے بولتے ہیں۔"

(انیس): "یہ مصرع میر صاحب نے ابن سعد کی زبانی کہا ہے۔ اس کو وہ شہدا سمجھتے ہیں۔"

(دبیر یے): "میر صاحب فرماتے ہیں۔ "گردن پہ نمایاں کئی جاگہ خط خنجر۔" یہ جاگہ کیا فصیح ہے؟"

(انیس): "جی ہاں۔ متروک لفظ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ "اک سو ورے آیا پرے سے صفت شیر۔" ورے پرے لکھنؤ والے مدت سے چھوڑ چکے ہیں۔ دہلی کی زبان ہے۔"

(دبیر یے): "مرزا صاحب کی شاعری میر صاحب سے قدیم تر ہے۔ یہ ان کے ابتدائی مرثیے کا مصرع ہے۔ اس وقت یہ بولتے تھے۔ ہاں، میر صاحب فرماتے ہیں۔ "پہنچے نہ صبا اس کے کبھی گرد کے دنبال۔" دنبال کیا بیہودہ، خلاف فصاحت اور متروک ہے۔ اور سنئے...... "جاتا تھا اشارے میں کماں داروں پہ جوں تیر۔" کیا جوں متروک نہیں؟ اور سنئے...... "آتا تھا پیادوں پہ سواروں کی صفیں چیر۔" "صفیں چیر کر کہنا چاہئے تھا یہ بھی وہی متروک بندش ہے۔"

(انیس): "مرزا صاحب نے "ٹھہر" کو "خیر" کا قافیہ کر دیا۔ اس سے بڑھ کر کیا ستم ہو گا۔"

(دبیریے): "اس میں کیا قباحت ہے؟ جب "ٹھیر" بولتے ہیں تو "خیر" و "سیر" کا قافیہ بھی ہو سکتا ہے۔ میر صاحب تو فرماتے ہیں۔ "بہ خدا فارس میدان تہور تھا حر۔" جناب عالی، تہور و جبن دونوں مذموم ہیں۔ صرف شجاعت ممدوح ہے۔ تہور اس کو کہتے ہیں کہ بے ضرورت اپنی جان دے دے۔ اور شجاعت اس کو کہتے ہیں کہ جہاں مرنا مستحسن و ممدوح ہو، وہاں کام آئے، حضرت حر نے تہور سے نہیں بلکہ شجاعت سے کام لیا ہے۔ اگر کوئی عربی کتاب آپ کو دست یاب نہیں تو اخلاق ناصری ہی پڑھ لیجیے۔"

(انیسیے): "کوئی متلاشی ہے سدا محفل غم کا۔" متلاشی غلط ہے۔

(دبیریے): "متلاشی لوگ دن رات بولتے اور لکھتے ہیں۔ البتہ غلط لفظ یہ ہے۔ "حر کون تھا اور کون ابن قین محلّی۔" محلی کے لام کو تشدید کیسی؟ محلی بلا تشدید صحیح ہے۔" (سبع مثانی ۳۹۔۴۰)

استفتا

باہمی مباحثوں سے کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تو نوبت فتویٰ طلبی تک پہنچ گئی۔ انیسیوں دبیریوں کا قضیہ اور دونوں استادوں کے درمیان ترجیح کا مسئلہ مذہبی عدالت میں پیش ہوا اور مجتہد العصر کو اس میں حکم بنایا گیا۔ اس سے پہلے دبیر کی ایک بیت کے معاملے میں فتویٰ طلب کیا گیا تھا۔ دبیر نے عظیم آباد کی ایک مجلس میں یہ بیت پڑھی تھی۔

اس رخش کے منھ پر کوئی ون چڑھ نہیں سکتا سرعت کا یہ عالم ہے کہ سن بڑھ نہیں سکتا

مرزا دبیر کے واپس جانے کے بعد انیسیوں کی طرف سے اس بیت کو بے معنی کہا گیا۔ عظیم آباد کی محفلوں میں اس پر خاصی بحثا بحثی ہوئی اور دبیریوں کی طرف سے اس کا اطمینان بخش مفہوم بیان نہیں کیا جا سکا۔ آخر مفتی میر عباس کو خط لکھ کر ان کی رائے دریافت کی گئی۔ یہ خط فارسی میں ہے اس کے چند جملوں کا ترجمہ (از ثاقب) درج ذیل ہے:

"اس شہر کے نکتہ رسوں اور معنی سنجوں اور اہل علم میں سے کسی کی سمجھ میں اس بیت کے معنی نہیں آئے بلکہ اکثر تو اسے مہمل بتاتے ہیں..... اگر شاعر کا یہ خیال ہے کہ اس شعر میں غلو ہے جو حسب عقل و عادت محال ہو تو اس صورت میں بھی نفی سن پر ثبوت چاہئے..... اور مرزا صاحب کی بیت بلکہ تمام ہند میں کچھ ثبوت اپنے دعوے پر نہیں ہے۔

از بس کہ آپ جامع علوم اور فن شاعری میں استاد کامل ہیں لہٰذا عرض ہے کہ یہ شعر اگر حقیقت میں مہمل ہو تو ویسا ہی تحریر فرمایئے تاکہ عبث اس کے معنی میں فکر نہ کی جائے..... اور اگر یہ شعر با معنی ہو اور اس جگہ کوئی اس باریکی کو نہیں پہنچا ہو تو جناب اس کے معنی مشرح و مفصل بہ دلائل تحریر فرمائیں..... تاکہ لذت مطلب سے جناب کی بدولت ہم بھی کامیاب ہوں اور منکروں کو ساکت کریں..... یہ امر مرزا صاحب ممدوح سے بہت دور معلوم ہوتا ہے کہ وہ مہمل فرمائیں.....

اور یہ خیال مرزا صاحب کے اس شہر سے تشریف لے جانے کے بعد دلوں میں آیا ہے ورنہ خود مرزا صاحب سے پوچھ لیا جاتا۔ یہ کاغذ بہت جلدی میں لکھا گیا ہے۔" (حیات دبیر (۱) ص ۲۹۱ بعد)

بیت کے مہمل ہونے کی جو دلیلیں "منکروں" نے پیش کی تھیں وہ بھی خط میں نقل کر دی گئی ہیں۔ یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ اس بیت کا مطلب دبیر کو لکھنؤ خط بھیج کر انہیں سے دریافت کیا جا سکتا تھا۔ لیکن مطلب مفتی صاحب سے پوچھا گیا۔ اس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ دبیر کا بتایا ہوا مطلب معترض انہیوں کو شاید قبول نہ ہوتا۔ دوسرا یہ کہ لکھنؤ سے دبیر کا جواب آتے آتے خاصا وقت لگ سکتا تھا۔ مفتی صاحب اس وقت کلکتے میں مقیم تھے جہاں لکھنؤ کی بہ نسبت خط جلدی پہنچتا تھا۔ مفتی صاحب کی علمی، ادبی اور غیر جانب دار حیثیت دونوں فریقوں میں مسلم تھی۔ اس لئے بھی ان کو قضیے میں حکم بنایا گیا۔

مفتی صاحب اپنے روزنامچے میں بتاتے ہیں کہ "سہ شنبہ بستم شہر ربیع الاول ۱۲۷۶ھ (۱۸ اکتوبر ۱۸۵۹) کو انہوں نے "دو مسئلہ عظیم آباد" کے جواب لکھے۔ ان میں سے ایک مسئلہ

"در استفسار معنی مصرع از کلام مرزا دبیر" تھا۔ (تجلیات ص ۱۶۰)

عظیم آباد کے اس خط کا جواب مفتی صاحب نے فارسی ہی میں دیا۔ انہوں نے تفصیل کے ساتھ اس بیت کی معنویت واضح کی۔ فارسی اور اردو شاعروں کے کلام سے اس نوع کے مبالغے کی مثالیں پیش کیں اور یہ بنیادی بات لکھی:

"پس اگر بنائے مضامین شعریہ بر قوانین حکمیہ ودلائل فلسفیہ گزاشتہ شود، در صحت امثال ایں اشعار سخنے می رود"

(اگر مضامین شعر کی بنا حکمت کے قوانین اور دلائل فلسفہ پر رکھی جائے تو (البتہ) اس قسم کے اشعار کی صحت میں کلام ہو سکتا ہے)

استفسار میں "منکروں" کے جو اعتراض نقل کیے گئے ہیں ان کی بنیاد حکمت اور دلائل فلسفہ ہی پر رکھنے کی غلطی (یا کم سے کم بد مذاقی) کی گئی تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ دبیر نے اپنے وقت سے بہت آگے بڑھ کر یہ مضمون باندھا تھا، اس لیے کہ جدید سائنسی نظریات (خصوصاً آئنسٹائن کے نظریہ اضافیت) کی رو سے تیز رفتاری کے باعث سن کا نہ بڑھنا ممکن مانا جا چکا ہے۔

یہ سوال جواب تو انیس اور دبیر کی زندگی میں اور فارسی زبان میں ہوئے تھے، لیکن دونوں استادوں کی وفات کے بعد باضابطہ استفتا کے انداز اور عربی زبان میں مفتی صاحب سے فتویٰ طلبی ہوئی اور مفتی صاحب نے بھی عربی ہی میں فتویٰ دیا۔ اصل عبارتیں مع ترجمہ کتاب "تردید موازنہ" میں اس طرح درج ہیں:

"استفتا: یا سیدی ان المومنین یتشاجرون فی باب جناب المیرزا سلامت علی دبیر وجناب السید ببر علی انیس اعلیٰ الله مقامه، فی اعلیٰ علّیین. بعضهم یقولون انّ جناب السید اشعر من المیرزا وبعضهم یرجحون المیرزا المبرور علی السید المغفور. فاحکم بینهم بالحق واکتب لنامن کان منهما اشعر من غیره بالافتاء فی هذا الباب وینفصل هذه القضیه بمایکتب لنا فی الجواب."

جواب: کلام المیرزا دقیق ملیح کلام السید حلو فصیح وبعدالاختلاف الذوقین والطعمین فلا محل الترجیح اذمن الناس من یحب الحلو ومنهم من یحب المالح ولکل منهما مواضع ومصالح۔"

ترجمہ استفتا: اے سید، مومنین مباحثہ کرتے ہیں مرزا دبیر اور میر انیس صاحب کے بارے میں۔ بعض کہتے ہیں کہ میر انیس شاعری میں بہتر ہیں مرزا دبیر سے اور بعضے کہتے ہیں کہ مرزا دبیر اولیٰ (ہیں) میر انیس سے۔ پس آپ حکم ہو جیے ان دونوں مرحومین کے باب میں، اور فتویٰ دیجیے کہ ان دونوں بزرگوں میں کون شاعر تر ہے۔

جواب: کلام مرزا کا دقیق اور نمکین ہے اور کلام سید کا شیریں اور فصیح ہے، بعد اختلاف ذائقہ اور طمع کے نہیں ترجیح کسی کو، کیونکہ کوئی شیرینی کو دوست رکھتا ہے، کوئی نمکینی کو، اور ہر شخص کو ان میں سے مصلحت ہے۔" (ص ۱۳)

مفتی صاحب کا جواب کتاب "تجلیات" میں بھی شامل ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل عبارت زائد ہے:

والعمر اشرف ان یصرف فی معرفۃ الاشعر بل الاھم ابتغاء مرضات اللہ ور ضوان من اللہ اکبر" (ص ۱۹۱)

ثاقب کا بیان ہے کہ "یہ مسئلہ مولوی ابو القاسم صاحب عرف مولوی مقرب علی خان صاحب (ہمشیر زادہ ارسطو جاہ منشی رجب علی خان صاحب مرحوم، میر منشی چیف کمشنری، پنجاب) سابق ہیڈ مولوی ضلع اسکول ریواڑی، و مولف "ذریعۃ النجات" نے پوچھا ہے" اور "مگر میرے عنایت فرما منشی سید علمدار حسین صاحب واسطی ملازم ریاست پٹیالہ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ مسئلہ دراصل خلیفہ سید محمد حسین مرحوم صاحب "اعجاز التنزیل" نے پوچھا تھا۔ ممکن ہے کہ آں جناب نے مولوی (مقرب علی خان) صاحب ممدوح سے خط لکھوایا ہو۔" (حیات دبیر ص ۲۹۰)

۵۔ شعری معرکہ

شاعری کے میدان میں انیسی دبیری جماعتوں کی طرف سے مقابلے کی طبع آزمائیاں ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً دبیر کے شاگرد میر شرف الدین نے ایک سلام کہا:

مثل فلک بلند ہیں منبر کہاں کہاں　　اے مجرئی ہیں ذاکر سرورؑ کہاں کہاں

اس سلام کے گیارہ شعروں میں دو دو چیزوں کے ذکر کا التزام کیا گیا ہے، مثلاً

مقتل سے تابہ کوفہ تو کوفے سے تابہ شام　　نیزے پہ شاہ دیں کا پھرا سر کہاں کہاں

روضے پہ شاہ تشنہ کے، سقے کی قبر پر　　چشم علیؑ سے بہتا ہے کوثر کہاں کہاں

رن میں محاصرہ تھا جدا، خیمے پہ جدا　　گھیرے تھا شہ کو شام کا لشکر کہاں کہاں

اور مقطع میں اس تلازمے کی طرف یوں اشارہ کیا:

دو کی ہے قید اس لئے مصرعے میں (ہے) شرف　　ہر شعر میں ردیف مکرر کہاں کہاں

(دفتر ماتم جلد ۷ اص ۷۱۔۱۵)

اسی زمین میں مونس کا یہ سلام بہت مشہور ہوا اور انیس نے اس کی تخمیس بھی کی:

اے مجرئی گیا سر سرورؑ کہاں کہاں　　قرآں لئے پھرے ہیں ستم گر کہاں کہاں

مونس نے اس سلام کے بیشتر شعروں میں دو کے بجائے چار چار چیزوں کے ذکر کا التزام کیا، مثلاً

شہروں میں، جنگلوں میں، پہاڑوں میں، دشت میں　　بھائی کو روئی زینب مضطر کہاں کہاں

مشہد میں، کربلا میں، نجف میں، مدینے میں　　بکھرے گل ریاض پیمبرؐ کہاں کہاں

صندوق میں، تنور میں، زنداں میں، دیر میں — رکھا حسین کا سر انور کہاں کہاں
دل میں، جگر میں، سینہ پر خوں میں، جان میں — ڈوبا ہے ایک غم کا یہ نشتر کہاں کہاں
(دیوان فصاحت عنوان ص ۷ ۳ـ ۱۳۶)

اسی زمین میں دبیر کا سلام بھی ملتا ہے:

ہے عکس گیسوے رخ اکبر کہاں کہاں — سنبل کہاں کہاں ہے گل تر کہاں کہاں

اس سلام میں مطلع کو چھوڑ کر سب شعروں میں، جن کی تعداد سولہ ہے، یہی چار چار چیزوں کا تلازمہ ہے۔ مثلاً

گل میں، شفق میں، لعل میں، خورشید حشر میں — ہے رنگ خون کشتہ خنجر کہاں کہاں
تنور میں، شجر میں، خزانہ میں، طشت میں — تھا ایک مصحف سر سرور کہاں کہاں
دربار میں، خرابے میں، جنگل میں، شہر میں — وردا گئی حسین کی خواہر کہاں کہاں
فرصت میں، گھر میں، قبر میں، محشر میں اے دبیر — آئے مدد کو ساقی کوثر کہاں کہاں
(دفتر ماتم جلد ۱۷ ص ۲۱ـ ۴۰)

انیس اور ان کے پیرو مجلس میں مرثیہ پڑھنے سے پہلے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتے تھے۔ دبیر کے یہاں فاتحہ پڑھنا ضروری تھا۔ اس پر دونوں طرف سے رباعیوں کا تبادلہ بھی ہوتا تھا۔ (غالباً) اوج فرزند دبیر نے فاتحہ نہ پڑھنے کی مثال یوں دی:

گویا کہ نماز بے وضو پڑھتے ہیں

اور اوج کے شاگرد سید سرفراز حسین خبیر نے یہ رباعی کہی:

حمد خلاق دوسرا پڑھتے ہیں — پھر نعت نبی صل علی پڑھتے ہیں
قرآں اور آل سے تمسک ہے ہمیں — ہم فاتحہ پڑھ کے مرثیہ پڑھتے ہیں
(بدر کامل حصہ اول، سرورق)

خاندان انیس کی طرف سے فاتحہ نہ پڑھنے کے جواز میں کہا گیا:

پڑھتے نہیں فاتحہ تو کچھ جبر نہیں — ناقصوں کو ہے کے مگر صبر نہیں
یاں فاتحہ پڑھنے سے غرض کیا عارف — منبر ہے رسولؐ کا کوئی قبر نہیں
(مرثیہ خوانی کا فن ص ۲۱ـ ۱۲۰)

سورۂ فاتحہ کی تلاوت کو قبر تک محدود کر دینے کے جواب میں دبیر والوں کی طرف سے کہا گیا:

بے سورۂ فاتحہ پڑھو جا کے نماز مسجد بھی خدا کا گھر ہے کچھ قبر نہیں

اور یہ کہ

بے بزم عزا میں فاتحہ رسم عزا مجلس تو ہے بے کس کی اگر قبر نہیں

(رباعیات دبیر، مقدمہ ص ۱۱)

دونوں جماعتوں میں اس طرح کی شاعرانہ نوک جھونک برابر ہوا کرتی تھی۔ مثلاً ناسخ کی ایک غزل ہے:

دھوپ بہتر پر شب فرقت کی بدتر چاندنی صاعقے کے طور سے پڑتی ہے مجھ پر چاندنی

(کلیات ناسخ ص ۳۰۲، دیوان ناسخ ص ۳۷۲)

مونس نے اس غزل کی زمین میں سلام کہا:

اے سلامی دیکھ کر بے روے اکبر چاندنی آفتاب حشر بن جاتی ہے مجھ پر چاندنی

(شمع تعزیت ص ۳۶۰)

مونس کے سلام کے بعد دبیر کے شاگرد قدیر نے بھی اسی زمین میں سلام کہا:

گرد تھی بجرائی پیش حسن اکبر چاندنی روبہ روے نیر اکبر ہو کیونکر چاندنی

لاش زہراؑ کے قمر کی دشت میں عریاں رہی لوٹتی ہے خاک پر اس غم میں گھر گھر چاندنی

(دفتر ماتم جلد ۱۷ ص ۲۳)

جب یہ سلام قدیر نے ایک مجلس میں پڑھا تو بہ قول ثاقب

"بعد مجلس ایک صاحب بولے:

آپ کے گھر میں تھی کب اے بندہ پرور چاندنی میر مونس کی اڑا لائے ہو جا کر چاندنی

قدیر نے فی البدیہہ جواب دیا:

آپ تو اندھے ہیں کہتی ہے رتوندی آپ کو شیخ ناسخ کہہ گئے ہیں سب سے بہتر چاندنی

(دربار حسینؑ ص ۱۶۶)

(پہلا مصرع میں نے کہیں یوں بھی پڑھا ہے: "خاک سوجھے آپ کو قبلہ رو تو بدی آتی ہے") مونس اور قدیر کا تاریخ کی زمین میں سلام کہنا کوئی خاص بات نہیں تھی، لیکن اگر یہ زمین مونس ہی کی نکالی ہوئی ہوتی تو اس وقت کی فضا میں قدیر زمین کے سرقے کے مرتکب یا مونس سے مقابلے کے مدعی قرار پاتے۔ انیس کے ایک سلام کے سلسلے میں ایسی ہی صورت حال پیدا ہوئی تھی اور اس نے ایک معرکہ چھیڑ دیا تھا۔

سلام "زمینوں کو" کا معرکہ

یہ معرکہ بھی براہ راست انیس اور دبیر کے درمیان نہیں بلکہ انیسیوں اور دبیریوں کے درمیان، لیکن دونوں استادوں کی زندگی میں، چھڑا تھا۔ معرکے کی روداد کچھ اس طرح ہے:

انیس کا جو سلام بہت مشہور ہوا، اور آج تک مشہور چلا آرہا ہے، اس کا مطلع ہے:

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو — ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

اس سلام کا ایک شعر اور مقطع ضرب المثل ہو چکا ہے:

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار — خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم — انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

اور معنی آفرینی کے لحاظ سے اس شعر کی خاص طور پر داد دی گئی:

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے — چنا ہے جامہ اصلی کی آستینوں کو

یہ سلام انیسیوں دبیریوں کے درمیان جس معرکے کی بنیاد بنا اس کے بارے میں حسب ذیل بیان ہمارے سامنے ہیں:

احسن: "میر انیس مرحوم نے کسی مجلس میں ایک سلام پڑھا، "حسینوں کو، مہ جبینوں کو۔" اس زمین میں میر صاحب کے ایک شعر کی عالم گیر شہرت ہوئی۔ ("یہ جھریاں نہیں ......") مرزا صاحب مغفور کو یہ زمین پسند آئی۔ انہوں نے بھی سلام کہا اور کسی مجلس میں پڑھے۔ بے فکروں کو شگوفہ ہاتھ لگا۔ معمولی بات کو میر صاحب کے سامنے رنگ آمیزیوں سے بیان کیا...... میر صاحب کی برہمی مزاج کے لئے یہ لطیفہ کافی تھا۔ پھر تو دونوں جانب طبع

آزمائیاں شروع ہو گئیں...... دونوں صاحبوں کے سلام کلیات مطبوعہ میں موجود ہیں۔"
(واقعات انیس ص ۳۱)

ثالث: احسن کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دفتر ماتم (کلیات دبیر) کی بیسوں جلدیں بندے نے چھان ڈالیں، یہ سلام نہیں ملا، اور ملے تو کیونکر، مرزا دبیر مرحوم نے کوئی سلام ہی اس زمین میں نہیں فرمایا۔ جھگڑا ابھی انیسیوں دبیریوں میں ضرور ہوا تھا مگر یہ محض غلط ہے کہ مرزا صاحب مرحوم نے جواب میں سلام کہا تھا۔" (حیات دبیر (۱) ص ۱۱۸)

شاد: بتاتے ہیں:

"خود مرزا صاحب نے ذاکر اول و دوم و سوم کے نام سے ذیل کا واقعہ مجھ کو لکھ بھیجا تھا کہ میر انیس کا ایک قدیم سلام تھا جس میں ایک شعر یہ بھی تھا، لگا رہا ہوں مضامین نو...... اس زمین میں مرزا اوج کے نام سے سلام کہا گیا...... میر مونس نے بھی سلام کہا۔ اس میں یہ شعر تھا۔

بھلا تردد بے جا سے ان میں کیا حاصل اٹھا چکے ہیں زمیں دار جن زمینوں کو

اب آؤ تو جاؤ کہاں۔ مرزا صاحب کی طرف سے تین تین شعر جواب میں کہے گئے۔"
(فکر بلیغ ص ۷۳۔۱۷۲)

اس طرح شاد ظاہر کر رہے ہیں کہ جوابی سلام دراصل دبیر نے کہا تھا لیکن اپنے نام سے مشہور نہیں کیا۔

شبلی: "میر انیس اکثر شعروں میں مرزا دبیر پر سرقے اور خوشہ چینی کی چوٹ کرتے ہیں، مثلاً بھلا تردد بے جا......" (موازنہ انیس و دبیر ص ۲۶۶۔۲۶۵)

محمد جان عروج: بتاتے ہیں کہ یہ شعر (بھلا تردد......) انیس کا نہیں ہے:

"یہ سلام کا شعر میر مونس صاحب کا ہے۔ جس صحبت میں یہ پڑھا گیا، میں خود موجود تھا۔ آغا میر کی ڈیوڑھی پر لکھنؤ میں جناب نواب میر محمد حسین صاحب کے یہاں جو ماہوار (مجلس)...... خاص میر مونس صاحب کے پڑھنے کی مقرر تھی، وہاں یہ سلام میر مونس

صاحب نے خود پڑھا تھا جس پر نواب ممتاز الدولہ بہادر کو ملال ہوا کیونکہ وہ مرزا دبیر صاحب کے شاگرد تھے، اور اٹھ کر چلے گئے۔"

عروج اس قضیے کی مزید تفصیل اس طرح بیان کرتے ہیں :

"اس کی اصل بنا یہ ہے کہ اس طرح میں ایک سلام جناب میر انیس صاحب نے فرمایا تھا۔ سب اشعار میں یہ شعر : یہ جھریاں نہیں...... زیادہ تر مشہور ہوا کہ نیا مضمون باندھا گیا ہے، باوجود (ے) کہ میر تقی دہلوی کے دیوان میں پوری لفظوں سے موجود ہے :

ہاتھوں پہ یہ جھریاں نہیں ہیں پیری جاے کو چن رہی ہے

اور اس طرح کے ردیف قافیے میں شعرائے سلف اردو کی غزلیں کہہ بھی گئے ہیں، کوئی نئی طرح ایجادی نہ تھی۔ بہر کیف اس پر مرزا اوج صاحب نے بھی ایک سلام کہا اور اور شعرائے موجودہ نے بھی طبع آزمائی کی۔ فقط "آستیوں" کے قافیے میں سب نے زور دیا۔ مرزا اوج صاحب نے بہت سے اشعار آستیوں کے فرمائے۔ لیکن جیسا شعر بادشاہ جم جاہ واجد علی شاہ اودھ کا نظم ہو گیا...... کوئی شعر ویسا نہ ہوا :

جہاد نفس عبادت میں مجھ کو ہے منظور وضو کے وقت الٹتا ہوں آستیوں کو

الحاصل جب یہ خبر عام ہوئی تو میر مونس نے دوسرا سلام اسی طرح میں کہہ کر اس مجلس موصوف میں پڑھا جس پر زیادہ تر نواب ممتاز الدولہ بہادر کو مخاطب کر کے پڑھا تھا۔ اس سبب سے نواب صاحب ممدوح کو ملال ہوا۔ یہ خبر جب میر انیس صاحب کو ہوئی تو میر مونس پر آزردہ ہوئے کہ یہ حرکت تم کو مناسب نہ تھی۔" (تردید موازنہ ص ۲۲۔۲۱)

ثاقب : عروج کے اس بیان کا حوالہ دیتے ہوئے مزید بتاتے ہیں :

"اس سلسلہ میں یہ طنزیہ شعر بھی تھا، بھلا تردد...... اور شاید یہ شعر بھی تھا :

نیا مزہ ہے کہ مضموں تو دست یاب نہیں مقابلے پہ چڑھاتے ہیں آستیوں کو

نواب ممتاز الدولہ مجلس سے اٹھ کر چلے گئے...... پھر تو انیسیوں اور دبیریوں میں تمام شہر میں شور مچ گیا۔ دبیریوں نے بعض متقدمین کی غزلیں اور شاید ایک دو سلام بھی دکھائے کہ پہلے بھی لوگ اس زمین میں کہہ چکے ہیں۔ مشیر مرحوم بھی زندہ تھے۔ انہوں نے بھی مرزا

صاحب کی شاگردی کے جوش میں بہت کچھ کہا۔ چنانچہ یہ ایک شعر اسی زمانے کا یاد ہے:

اساتذہ کی ہیں غزلیں سلام بھی اکثر   نیا سمجھتے ہیں پھر لوگ ان زمینوں کو"

(حیات دبیر ا، ص ۱۱۹)

اپنی ایک اور کتاب "دربار حسین" میں ثاقب بتاتے ہیں کہ "حیات دبیر" میں سلام کے قضیے کی تفصیل لکھنے کے بعد "اس کا صحیح واقعہ مجھے بعض معمر اہل لکھنؤ سے یہ معلوم ہوا کہ اول اول اس زمین میں مرزا اوج مرحوم نے سلام کہا تھا۔ پھر میر انیس مغفور نے فرمایا۔ پھر میر مونس رحمہ اللہ نے سلام کہہ کر نواب میر محمد حسین صاحب کی چھبیسویں کی مجلس میں پڑھا" (اور "بھلا تردد"...... اور "نیا مزہ ہے...... " پر نواب ممتاز الدولہ آزردہ ہو کر مجلس سے اٹھ گئے۔ ص ۲۲)

شعر "بھلا تردد بے جا...... " پر ثاقب نے یہ حاشیہ دیا ہے:

"میر مونس یہ سمجھے ہوئے تھے کہ میر صاحب کے سلام پر مرزا اوج نے سلام کہا۔ اسی کی طرف اس شعر میں اشارہ ہے، حالانکہ مرزا اوج پہلے سلام کہہ کر پڑھ چکے تھے۔ اس کی تصدیق خود حضرت اوج مرحوم نے بھی ایک موقع پر فرمائی تھی جس مجمعے میں میر سرفراز حسین صاحب خبیر لکھنوی بھی موجود تھے۔" (ص ۲۲)

تقدم کے سلسلے کا یہ بیان اس قضیے کے دوسرے بیانوں سے مختلف اور کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ دوسرے بیان بتاتے ہیں کہ انیس نے اوج اور مونس دونوں سے پہلے اس زمین میں سلام کہا تھا۔ البتہ اوج اور مونس میں پہلے اوج نے، پھر مونس نے جواب میں سلام کہا (اغلباً اوج نے ثاقب کے مذکورہ مجمعے میں اسی کی تصدیق کی تھی، سننے والوں کو مونس کے بجائے انیس کا نام یاد رہ گیا)۔ اگر انیس پر اوج کا تقدم مان لیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ:

(۱) انیس نے اپنے حریف کے بیٹے اور اپنے سے کوئی پچاس سال چھوٹے اوج کے سلام پر سلام کہا۔

(۲) مونس کو یہی پتا نہیں تھا کہ ان کے بھائی اور استاد انیس نے اوج کی اٹھائی ہوئی زمین میں تردد کیا ہے نہ کہ برعکس۔

(۳) اس زبردست غلط فہمی میں مبتلا ہو کر جب مونس نے اوج پر انیس کی زمین کو غصب کرنے کا الزام لگایا تو دبیریوں کی طرف سے یہ تو کہا گیا کہ اس زمین میں "شعرائے سلف" (بہ قول عروج) اور "متقدمین" (بہ قول ثاقب) اور "اساتذہ" (بہ قول مشیر) غزلیں اور سلام کہہ گئے ہیں لیکن سب سے زیادہ مسکت بات نہیں کہی گئی کہ خود اوج اس زمین میں انیس سے پہلے سلام کہہ چکے ہیں۔

یہ سب قباحتیں ثاقب کے مذکورہ حاشیے سے پیدا ہوتی ہیں۔ دست یاب بیانوں کے تقابل سے جو صورت واقعہ سامنے آتی ہے وہ اس طرح ہے:

(۱) دبیر کے بیان میں "ذاکر اول ودوم وسوم" کے لفظوں اور اس کے بعد سلام کہنے والوں کی ترتیب سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے اس زمین میں انیس نے سلام کہا، پھر اوج نے، پھر مونس نے۔

(۲) قضیہ انیس کے سلام کہنے کے ساتھ ہی نہیں، بلکہ اس کے برسوں بعد شروع ہوا۔ دبیر بتاتے ہیں کہ اوج والا سلام انیس کے ایک "قدیم" سلام کی زمین میں کہا گیا تھا۔ اس سلام میں اوج نے "آستینوں" کے قافیے کو طرح طرح سے باندھا۔

(۳) کسی نو عمر شاعر کا کسی استاد کی زمین میں شعر کہنا ایک طرح سے استاد کو خراج تحسین پیش کرنا ہوتا ہے، لیکن اوج انیس کے حریف دبیر کے بیٹے تھے، اس لئے، اور اس لئے بھی کہ ان کے سلام میں "آستینوں" کے قافیے پر خاص زور دیا گیا تھا، یہ سمجھا گیا کہ انھوں نے انیس کے مقابلے پر اور جواب میں یہ سلام کہا ہے، اور یہ بھی خیال کیا گیا (کم سے کم انیسیوں نے یہی خیال کیا) کہ سلام اوج نے نہیں بلکہ ان کے نام سے دبیر نے کہا ہے۔

(۴) معرکہ اس وقت چھڑا جب اس سلام کو انیس کے سلام کا جواب سمجھ کر مونس نے جواب الجواب کہا اور نواب میر محمد حسین کے یہاں کی مجلس میں اپنا سلام پڑھا جس میں کئی طنزیہ شعر تھے۔ اس مجلس میں واجد علی شاہ کے چچازاد بھائی نواب ممتاز الدولہ (محمد علی شاہ کے بیٹے ناصر الدولہ کے فرزند) بھی موجود تھے۔ وہ دبیر کی شاگرد سلطان عالیہ کے شوہر اور یہ

قول عروج خود بھی دبیر کے شاگرد تھے۔ مونس کے طنزیہ شعروں سے آزردہ ہو کر وہ مجلس سے اٹھ گئے۔ ممتاز الدولہ کے سے مقتدر رئیس کا مجلس چھوڑ کر چلا جانا معمولی واقعہ نہیں تھا۔ سارے شہر میں اس کا شہرہ ہو گیا۔ یہ زمین اور اس میں کہے جانے والے سلام گرم بحثیوں کا موضوع اور شعری معرکوں کا میدان بن گئے اور میاں مشیر وغیرہ بھی اس میدان میں اتر آئے۔

مرزا اوج مونس سے بھی پینتیس چھتیس سال چھوٹے تھے اور ان سے دوبدو ہونا مونس کے شایان شان نہیں تھا۔ اسی لئے ان کا روئے سخن اگرچہ بہ ظاہر اوج کی طرف تھا لیکن دبیر یہ سمجھ گئے، اور صحیح سمجھے، کہ ان کے طنز کا نشانہ دبیر ہیں جنہیں اوج کے سلام کا اصل مصنف سمجھا گیا ہے۔ ممتاز الدولہ کی آزردگی کا سبب یہی تھا کہ ان کی موجودگی میں دبیر پر چوٹ کی گئی اور مشیر نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ "جلی کٹی مرے استاد سے کرے جو کوئی......"

سلاموں کے اس معرکے میں مقابلے کے شعر تو بہت کہے گئے لیکن تنقیدی اعتراضوں کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ ایک اعتراض تو یہی تھا کہ انیس کا "مستیوں" والا شعر میر سے ماخوذ ہے (شمس الرحمن فاروقی جنہوں نے اپنی تصنیف "شعر شور انگیز" کے سلسلے میں کئی برس تک میر کے غزلیہ کلام کا متواتر مطالعہ کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ میر سے منسوب وہ شعر انہیں میر کے کسی دیوان میں نظر نہیں آیا)۔ دوسرا اعتراض انیس کے مطلع

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

پر شامت کے بہ قول یہ کیا گیا:

"دعویٰ تو یہ فرمایا ہے کہ فکر ترقی ہے، اور بجائے ترقی کے دوسرے مصرعے میں ارشاد ہوتا ہے کہ "ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو۔" یہ ترقی کا پورا پورا ثبوت کب ہوا؟ یوں فرماتے تو ترقی ثابت ہوتی:

"ملی ہے عرش پہ معراج ان زمینوں کو"

(حیات دبیر (۱) ص ۱۲۰)

اس اعتراض اور اوج کے مندرجہ ذیل مطلع کا ربط ظاہر ہے:

یہ زور مدح علی کا ہے خوش یقینوں کو　　زمیں سے لے گئے گردوں پہ ان زمینوں کو

اور اوج کا یہ شعر انیس کے "خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو" سے مربوط ہے:

ہزار خوشے ہیں مضموں کے ایک دانے میں　　غنی کیا مرے خرمن نے خوشہ چینوں کو

اشعار

سردار میرزا بتاتے ہیں کہ اوج کے سلام میں "پچیس شعر سے زیادہ آستینوں کے قافیے میں ہیں۔" اور اس سلام کے اٹھائیس شعر نقل کرتے ہیں۔ (رد واقعات انیس ص ۷ ببعد)۔ مذکورہ پچیس شعروں میں یہ شعر بھی ہے جس کا مضمون واجد علی شاہ سے منسوب شعر ("جہاد نفس......") کے مضمون سے لڑ رہا ہے:

نماز اہل یقیں کی جہاد اکبر ہے　　وضو کے وقت چڑھاتے ہیں آستینوں کو

سلاموں کے شعروں، خصوصاً انیس اور مونس کے شعروں، میں خاصا خلط مبحث ہے۔ متعدد اشعار دونوں کے یہاں مشترک ہیں۔ مونس کا سلام جو ان کے مجموعے "دیوان فصاحت عنوان" میں شائع ہوا ہے۔ (ص ۳۵ ببعد) اس میں چالیس شعر ہیں۔ خاندان انیس کے سلاموں اور رباعیوں کے ایک قلمی مجموعے میں انیس کا سلام چھتیس شعر کا ہے (ص ۹۰ ببعد)۔ اس کے کئی شعر مونس کے دیوان سلام میں موجود ہیں (قلمی مجموعے میں مونس والا سلام نہیں ہے)۔ انیس والے سلام میں کئی شعر ایسے ہیں جن میں مخالفوں پر اس زمین کے سرقے کا الزام لگایا گیا ہے۔ یہ شعر مونس کے یہاں بھی ملتے ہیں اور ظاہر ہے کہ انیس اور اوج کے سلاموں کے بعد کہے گئے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بھی انیس کے سلام میں شامل کچھ شعروں کو الحاقی قرار دیا ہے۔ (رثائی ادب، میر انیس نمبر ۱۹۷۰)، مگر سید نجیب حسین اطلاع دیتے ہیں کہ ان میں سے چار شعر انیس ہی کے نام سے اس قلمی بیاض میں بھی موجود ہیں جو انیس کے قدیم اور خاص شاگرد میر سلامت علی کی نقل کی ہوئی ہے اور

یہ کہ "کسی شاگرد رشید سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی دوسرے شاعر کے اشعار اپنے استاد سے منسوب کر دے، لہٰذا یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ اشعار میر انیس ہی کے ہیں۔" (رثائی ادب، نصف صدی نمبر ۱۹۹۸)

معرکے کی گرما گرمی کے زمانے میں اس زمین کے شعر لکھنؤ کی فضا میں گونج رہے تھے اور اس صورت میں شعروں کے انتساب میں غلط فہمی ہو جانا بہت ممکن ہے۔ اب حتمی طور پر ہر شعر کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ دراصل کس کا ہے، لہٰذا اس مسئلے میں الجھنے سے بہتر ہے کہ ان شعروں کی معرکہ آرائی دیکھی جائے۔

انیس کی زمین میں طبع آزمائی کرنے پر انیسیوں کی طرف سے اس طرح تعریض کی گئی:

بھلا تردد بے جا سے ان میں کیا حاصل　　اٹھا چکے ہیں زمیں دار جن زمینوں کو

(دیوان فصاحت عنوان)

خبر نہیں انہیں کیا بندوبست پختہ کی　　جو غصب کرتے ہیں وہ غیر کی زمینوں کو

(ایضاً)

دبیریوں نے جواب دیا کہ یہ زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے:

قبول شرع میں دعوائے بے دلیل نہیں　　دکھائیں گھر کے قبالے میں ان زمینوں کو

(فکر بلیغ)

انیسیوں نے کہا:

حصول غیر حسد کیا ہے خوشہ چینوں کو　　خراب کرتے ہیں بوئی ہوئی زمینوں کو

(دیوان فصاحت عنوان، مجموعہ قلمی)

دبیریوں نے اس کی یوں تاویل کی:

ہمارے ابر قلم سے ہے بہ عمل بارش　　کہ مینہ سے نفع ہے بوئی ہوئی زمینوں کو

(فکر بلیغ)

انیسیوں نے "آستینوں" کے قافیے پر طبع آزمائی کو یوں نشانہ بنایا:

مزہ یہ طرفہ ہے مضموں تو دستیاب نہیں　　مقابلے پہ چڑھاتے ہیں آستینوں کو

(حیات انیس، مجموعہ قلمی)

دبیریوں نے اس شعر کو انیسیوں کا مقابلے سے کترانا قرار دیا:

مقابلے پہ یہ آمادہ ہوں بہ خیر مگر ہوے جو تنگ الٹتے ہیں آستیوں کو
(فکر بلیغ)

اوج نے یہ شعر بھی کہا:

مقابلے میں جو الٹا کیے سدا مضموں جواب میں وہ الٹتے ہیں آستیوں کو
(ردواقعات انیس)

یہاں بھی حریفوں پر مضمون الٹنے کا وہی الزام ہے جو دبیر کی بیت میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ لیکن اوج کا یہ شعر ایک اور لحاظ سے قابل غور ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس زمین میں اوج کے سلام کے بعد مونس کے سلام پڑھنے اور اس میں اوج کے سلام پر چوٹیں کرنے کے بعد یہ معرکہ شروع ہوا، اور اوج مونس کی چوٹوں سے پہلے اس زمین میں سلام کہہ چکے تھے، لیکن یہ شعر مونس کی چوٹ "مقابلے پہ چڑھاتے ہیں....." کا جواب ہے اور ظاہر ہے مونس کے سلام کے بعد کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اوج نے اپنے سلام میں معرکے کی پیش رفت کے لحاظ سے شعروں کے اضافے کیے تھے۔ انیس اور مونس کے سلاموں میں شامل چھتیس اور چالیس شعروں کے بارے میں تقریباً یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ہی دورے میں کہے ہوئے شعر نہیں ہیں بلکہ ان میں جواب اور جواب الجواب کے جواب والے شعر بھی، جو بعد میں کہے گئے، اضافہ ہوئے ہیں۔ انیس کے "خوشہ چینوں" والے شعر اور کچھ اور تعریضی شعروں کو اس زاویے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ جب ان کے سلام کی زمین میں فریق مخالف نے طبع آزمائی کی تو انیس نے بھی اپنے "قدیم" سلام میں کچھ شعر بڑھائے۔ یا ایک اور سلام کہا اور اب اس شعر کا اضافہ کیا:

لٹا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

اس صورت میں لفظ "پھر" کی معنویت بڑھ جاتی ہے۔ اس قیاس کو دبیر کے حوالے سے شاد کی یہ اطلاع کچھ کم زور کر دیتی ہے کہ یہ شعر انیس کے "قدیم" سلام میں موجود تھا۔ بہر حال اوج کے سلام میں اس کا جواب دیا گیا اور مشیر نے بھی براہ راست انیس کے شعروں

پر چوٹیں کیں مثلاً اسی شعر کے حوالے سے کہا:

جلی کٹی مرے استاد سے کرے جو کوئی　　تو پھونک دوں مع خرمن میں خوشہ چینوں کو

(دربار حسینؑ)

اور انیس کے مقطع:

خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم　　انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

کے دوستانہ انداز کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا:

جنھیں ہے پھوٹنے کا ڈر وہ خود بچالیں گے　　مری بلا سے لگے ٹھیس آبگینوں کو

(دربار حسینؑ)

اس سے خیال ہوتا ہے کہ انیس اس معرکے میں بھی، جو ان کے سلام کہہ لینے کے بعد شروع ہوا، کچھ نہ کچھ شریک تھے، یا کم سے کم فریق مخالف نے ان کو بھی شریک سمجھا۔

انیسیوں کی طرف سے یہ شعر بھی کہے گئے:

اجاڑ کرنے سے کھیتوں کے ہوگا کیا حاصل　　وہ کون ہیں کہ بساتے ہیں جو زمینوں کو
ہر ایک شعر ہے مضمون تازہ سے آباد　　ہمیں بساتے ہیں اجڑی ہوئی زمینوں کو
ہمارے باغ کو چھینا بہت مگر نہ ملا　　سوائے خردہ ملا کچھ نہ خردہ بینوں کو
اسیر جہل مرکب وہی رہیں یارب　　مرے ہنر کی خبر ہو نہ عیب بینوں کو

(دیوان فصاحت عنوان)

اور ان شعروں میں "اوج" کے لفظ نے بات کو ذاتیات تک پہنچادیا:

رسائی ہوگی مرے اوج فکر تک کیونکر　　بلند بام ہے یہ طے کرو تو زینوں کو

(دیوان فصاحت عنوان)

زمین پہ پاؤں نہیں رکھتے چرخ پر ہے دماغ　　خدا نے اوج دیا ہے گا یہ کمینوں کو

(دیوان، مجموعہ قلمی)

دبیریوں کی طرف سے بھی سخت جواب دیے گئے۔ مشیر کا مقطع ہے:

ہزار بار سرِپا کے منہ پہ چڑھتے ہیں　　مشیر کیا کہوں ان احمق الذینوں کو

(دربار حسینؑ)

نوبت اس سے بھی آگے تک پہنچ گئی تھی۔ ادیب مرحوم مشیر سے منسوب ایک شعر سناتے تھے جو مجھ کو نامکمل صورت میں اس طرح یاد رہ گیا ہے :

.... انیس و مونس و انس ابھی نچاؤں گا گلی کا ناچ تینوں کو

اس طرح معرکے نے بدارخ اختیار کر لیا اور اس قضیے کا ختم کرانا ضروری ہو گیا۔ عروج، احسن، ثاقب وغیرہ بتاتے ہیں کہ اہل شہر نے کچھ مدت تک اس معرکہ آرائی کا لطف لیا۔ آخر فریقین میں مصالحت کرادی۔ مشیر کو دبیر نے انیس سے اور مونس کو انیس نے دبیر سے معافی منگوائی اور انیس کے سلام پر قائم یہ نوک جھونک ختم ہوئی۔ لیکن انیس بہت نازک مزاج اور زود رنج تھے۔ انہیں دیکھنے والے ایک بزرگ نے ادیب مرحوم کو بتایا تھا :

"انیسیوں اور دبیریوں میں جو نوک جھونک رہا کرتی تھی اس نے کچھ ایسی نامناسب صورت اختیار کی کہ میر انیس نے مجلس پڑھنا ترک کر دیا۔" (بیان میر نواب علی)

ممکن ہے یہ ترک مرثیہ خوانی سلام کے اسی قضیے کا رد عمل ہو۔

واجد علی شاہ کا سلام

ظاہراً اسی قضیے کی وجہ سے انیس کے سلام اور "آستینوں" والے شعر کی شہرت کلکتے میں اودھ کے معزول بادشاہ واجد علی شاہ اختر تک پہنچ گئی تھی اور انہوں نے اس زمین کا غالباً سب سے طویل (پچاس شعر کا) سلام کہا۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب ان کی کتاب "ملک اختر" کے مشمولات کے بیان میں بتاتے ہیں :

"ایک سلام میر انیس کے اس مشہور سلام کی زمین میں کہا ہے ...... جس کا یہ شعر بہت مشہور ہوا، "یہ جھریاں نہیں ...... "اس سلام کی شہرت بادشاہ تک پہنچی اور رفعت الدولہ نے ان سے اس زمین میں سلام کہنے کی درخواست کی جس کو بادشاہ نے قبول کیا، جیسا کہ ذیل کے مصرعوں سے ظاہر ہے ...... بادشاہ نے اس زمین میں پچاس شعر کا سلام کہا ہے جس میں دس شعر "آستینوں" کے قافیے میں ہیں۔" (سلطان عالم واجد علی شاہ ص ۱۷۴-۱۷۵)

"ملکِ اختر" میں یہ سلام اس طرح شروع ہوا ہے:

مناسب ایسا ہے دنیا کے دوربینوں کو　　کہ پاس ان کے جانچیں مرے نگینوں کو
مری طرح سے تردد کریں تو حاصل ہو　　اجارہ لیتے ہیں شاعر اگر زمینوں کو
کیا یہ رفعت دولت نے عرض وقت سحر　　بلند رکھے خدا میرے رتبہ بینوں کو
کہ اس زمین کی اختر بھی سیر فرمائے　　دکھائی ہے یہ زمیں چرخ کے حسینوں کو
یہ بلحہ مصرع فکر انیس عرض کیا　　شکن ضعیفی کی دکھلائی دوربینوں کو
کہ اس طرح سے لکیریں ہیں شیب کی ظاہر　　"چنا ہے جامہ اصلی کی آستینوں کو"
پسند آیا یہ مصرع کیا کروں گا فکر　　کمال طبع دکھاؤں گا خردہ بینوں کو
بس اب شروع کروں طرز قافیہ کا بناؤ　　قلم میں جمع کروں سب کی آستینوں کو

اس کے بعد "آستینوں" کے قافیے میں نو شعر اور ہیں مگر ان میں عروج کا بیان کردہ شعر "جہاد نفس...... وضو کے وقت" نہیں ہے۔ اس قافیے میں بادشاہ کی طبع آزمائی اس طرح ختم ہوتی ہے:

اگر بیان کروں قافیہ نہ بدلوں میں　　ہزار پردے میں لکھوں میں آستینوں کو
مگر پسند نہیں شاعریٔ دم گریہ　　بس اب تو قطع کر اختر ان آستینوں کو

(ص ۹۱ بعد)

واجد علی شاہ کے اس سلام کو معرکے کی ضمنی پیداوار سمجھنا چاہیے اور اگرچہ اس کے ایک شعر "مری طرح سے تردد کریں......" میں "بھلا تردد بے جا......" کے جواب کا سا انداز ہے لیکن واجد علی شاہ انیسیوں دبیریوں کی فرقہ بندی سے الگ اور دونوں استادوں بلحہ انیس کے بھائی انس، مونس اور دوسرے ذاکروں کے بھی قدر دان اور دعا گو تھے۔ ان کے ایک مرثیے "مطبوع طبع خرد و کلاں یہ کلام ہو۔" کے کچھ مصرع دیکھیے:

"خوش فکر ہیں دبیر سلامت رہیں مدام"
"جو ذاکر حسینؑ ہوں وہ تاج دار ہوں　　مونس، انیس، انس، سبھی شہر یار ہوں"
"ظاہر زباں انھوں نے ہے کی پاک خاک سے"

"میں کم سنی سے عاشق نظم دبیر ہوں   واللہ لطف شعر میں اس کے اسیر ہوں"
مونس، انیس، سب کا ہوں میں خوشہ چین باغ"

(توشۂ آخرت ص ۵۳۹ بجد)

۶۔ معرکے کی سنگینی اور دیرپائی

مفتی میر عباس سے انیس و دبیر کے بارے میں فتویٰ طلبی اس وقت ہوئی جب انیس اور دبیر دونوں کی وفات ہو چکی تھی۔ اس سے معرکے کی دیرپائی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مزید اندازہ انیس کے پوتے دولھا صاحب عروج کے ایک واقعے سے ہوتا ہے جو اس فتویٰ طلبی کے بھی عرصے بعد پیش آیا تھا۔ اس وقت دولھا صاحب گورکھپور میں ایک تحصیل دار کے یہاں مجلسیں پڑھ رہے تھے۔ تیسری تاریخ کی مجلس کا حال دولھا صاحب کے سوانح نگار نے اس طرح بیان کیا ہے:

"(دولھا صاحب) منبر پر تشریف لے گئے۔ بستے میں سے یہ مرثیہ واسطے پڑھنے کے نکالا:

پھر بہار آئی گلستان سخن کھلتا ہے   جس میں سب پھول نئے ہیں وہ چمن کھلتا ہے

اس روز افیون اتفاق سے بہت زائد ہو گئی تھی کہ مرثیے کے حروف تک دکھائی نہ دیتے تھے۔ یہ مرثیہ شروع کیا..... چونکہ اس وقت نشہ بہت زائد تھا، پہلا مصرع تو صحیح پڑھے، دوسرا مصرع پڑھے تو یہ پڑھے: "جس میں سب پھول نے تھے وہ چمن کھلتا ہے" مکرر پانچ چھ مرتبہ اس مصرع کو "نئے" کی جگہ "نے" پڑھے اور آگے مرثیہ نہ چلا۔ یہاں تک نوبت آئی کہ صاحب خانہ نے کہا کہ "کیا عینک حاضر کروں؟" کہا، "بسم اللہ۔" انھوں نے عینک دی۔ پھر بھی مرثیہ نہ چلا۔ عینک لگا کے بھی وہی "نے" کی لفظ پڑھے۔ آخر کار صاحب خانہ نے عرض کیا کہ "مرثیہ آج ہی آیا ہے۔ ان دیکھا مرثیہ ہے۔ کل سے پڑھیے گا۔ آج مرثیہ ملاحظہ فرما لیجیے گا۔" کہا کہ "بہتر۔" یہ کہ کر منبر سے اتر آئے۔ ایک صاحب منبر کی داہنی جانب مرثیہ لیے بیٹھے تھے۔ وہ خاندان مرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ صاحب خانہ نے ان سے کہا کہ "بسم اللہ،

آج کچھ آپ پڑھئے کہ مجلس خالی نہ جائے۔" وہ خوش ہو کر منبر پر فوراً چلے گئے جاتے ہی بستہ کھولنے لگے۔ مرثیہ نکال کر شروع کرنا چاہتے تھے کہ بائیں جانب منبر کے ایک شریف آدمی نہایت بہادر تشریف رکھتے تھے اور آٹھ دس ان کے احباب بھی اس جگہ بیٹھے تھے۔ ان کی لاٹھی کونے سے لگی رکھی تھی کہ انہوں نے...... اٹھا کر مرثیہ خوان صاحب کے سر پر اس زور سے ماری کہ وہ بے چارے چکر کھا کر منبر سے نیچے گر پڑے، اور کہا کہ "تیری یہ لیاقت ہے کہ انیس کے پوتے کے بعد منبر پر جائے؟" یہ کہہ کر اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ "دولہا صاحب کو حلقے میں لے کر سرائے میں لے جاؤ۔" اور خود لاٹھی پکڑ کے تحصیل دار کی جانب جھپٹے اور کہا کہ "یہ تحصیل دار کا بچہ بنا ہے، انیس کے پوتے کے بعد دوسرے شخص کو بھیج دیا۔ میں مار ڈالوں گا۔ زندہ نہ رکھوں گا۔" لوگ درمیان میں آگئے اور رفع شر کر دیا۔" (دولہا صاحب عروج ص ۵۷۔۵۶)

معرکے کی شدت کا اندازہ انیس اور پھر دبیر کی وفات سے مربوط ان تین واقعوں کے تجزیے سے ہوتا ہے:

ا۔ (اودھ اخبار کی یہ خبر نقل کی جا چکی ہے کہ) انیس کی وفات ہوئی تو دبیر ان کی میت پر آکر بہت روئے۔

۲۔ دبیر نے انیس کی وفات کا جو پہلا قطعہ تاریخ کہا اس کے مادے پر یہ اعتراض کیا گیا کہ اس سے انیس کا سال وفات برآمد نہیں ہوتا۔

۳۔ دبیر کی نماز جنازہ میں مونس شریک ہوئے اور معززین شہر نے اس بات کو بہت پسند کیا۔

ان میں قطعہ تاریخ کے واقعے پر پہلے غور کرنا چاہئے۔ یہ فارسی قطعہ انیس کو ایک عمدہ اور بہت اہم خراج عقیدت تھا جو ان کے سب سے زبردست، بلکہ واحد، مدمقابل نے پیش کیا تھا، اور اس سے پہلے ان کی میت پر جا کر اور ان کو معجز بیان اور فصیح اللسان کہہ کر بہت گریہ کیا

تھا۔ یہ دونوں باتیں انھیں کے دل سے دبیر کے خلاف ساری کدورت ختم کردینے کے لئے کافی ہونا چاہئے تھیں اور قطعہ تاریخ کی تو ان حلقوں میں جتنی بھی قدر کی جاتی کم تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ اس کے درست اور نادرست ہونے کی بحث میں زبانی اور تحریری معرکہ چھڑ گیا جس کی تفصیل "حیات دبیر" وغیرہ میں درج ہے۔ دبیر کا قطعہ اولاً مختصر، ایک دستاویز کے مطابق تین اور دوسری کے مطابق صرف دو شعر کا، تھا جس کا کوئی شعر مروجہ اور مطبوعہ چودہ شعر کے قطعہ تاریخ میں شامل نہیں ہے۔ (اردو (۳) ۱۹۹۰) اور اس کے صرف آخری مصرعے "طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس" سے وفات انیس کا ہجری سال (۱۲۹۱) برآمد ہوتا تھا، لیکن یہ سنہ زر و بینہ کے مشکل قاعدے سے نکلتا تھا۔ جب اس مادے پر اعتراض ہوئے تو دبیر نے نیا اور طویل قطعہ تاریخ کہا اور مادہ تاریخ میں پیش مصرع "آسماں بے ماہ کامل، سدرہ بے روح الامیں" کا اضافہ کردیا۔ اب دونوں مصرعوں کے عدد مل کر ۱۸۷۴ ہو گئے جو انیس کی وفات کا عیسوی سال ہے اور دبیر نے اس کی نشاندہی کے لئے یہ شعر بھی کہہ دیا۔

در سنین عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف گرچہ طبعم بود محزون و مکدر بے انیس

(میں نے عیسوی سنہ میں صاف صاف تاریخ کہہ دی حالانکہ انیس کے بغیر میری طبیعت محزون اور مکدر تھی) اور اب یہ تاریخ سامنے آئی:

آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامیں طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

اس طرح معترضوں کی بدولت دبیر کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ ایسی پر شکوہ تاریخ کے مصنف ہو گئے جس کی مثال اردو اور فارسی شاعری میں شاید ہی مل سکے، لیکن ان کو اس قضیے سے دلی تکلیف پہنچنا فطری بات تھی۔ سید خیرات احمد محبّ تامت کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"مجھے خوب یاد ہے کہ جس وقت یہ قطعہ تاریخ (ہجری) نکلا تھا اس وقت یہ خبر مشتہر ہوئی تھی اور مجھ تک پہنچی تھی کہ جب اس مصرعے پر اعتراض ہونے کی خبر جناب مرزا صاحب مرحوم کے گوش زد ہوئی تو حضرت نے ایک روز بر سر منبر فرمایا کہ ہزار افسوس کہ میرے بھائی کے انتقال سے لکھنؤ ایسا خالی ہو گیا کہ اب دبیر کے کلام کا سمجھنے والا کوئی نہ رہا۔ اب میں کیا کہوں اور کس کے لئے کہوں۔ یہ فرما کر حضرت بہت متاثر ہوئے۔ اسی عالم میں

زبردینڈ کے قاعدے سے صحیح اعداد نکال دیئے اور اس کے بعد پھر کچھ نہ کہا۔ (حیات دبیر (۲) ابتدائیہ ص ۴۵)

انیس کی میت پر دبیر کے آنے کی خبر اودھ اخبار میں شائع ہوئی تھی لیکن ان کی تدفین وغیرہ اور ترحیم کی مجلسوں میں دبیر کی شرکت کی خبر نہیں ملتی۔ اس پر غور کرنے سے پہلے خود دبیر کی نماز جنازہ میں مونس کی شرکت پر غور کرنا چاہئے جس کی اطلاع مونس نے انیس کے ایک فدائی حکیم سید علی دولمی پوری کو ایک خط میں اس طرح دی تھی :

"حال انتقال مرزا دبیر صاحب یقین کہ بہ سمع والا رسیدہ باشد۔ نہایت صدمہ شد و شریک نماز جنازہ شدم کہ خالی از ثواب نہ بود۔ عمائد و شرفائے شہر کمال ایں امر را پسند نمودند۔" (مکاتیب مونس)

(مرزا دبیر صاحب کی وفات کا حال یقین ہے آپ نے سنا ہو گا۔ انتہائی صدمہ ہوا اور میں ان کی نماز جنازہ میں شریک ہوا کہ یہ ثواب سے خالی نہ تھا۔ شہر کے عمائد اور شرفا نے اس بات کو نہایت پسند کیا۔)

ایک بہت بڑے مرثیہ گو کی نماز میت میں کسی مرثیہ گو کی شرکت کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ لیکن معززین شہر کا اظہار پسندیدگی ظاہر کرتا ہے کہ دبیر کی نماز جنازہ میں مونس کی شرکت بہت خاص اور غیر متوقع بات تھی۔ گویا متوقع بات یہ تھی کہ دبیر کے آخری رسوم میں سے کسی میں بھی خاندان انیس کا کوئی آدمی شریک نہیں ہو گا۔

مونس کے بیان سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ انیس کی نماز جنازہ میں دبیر شریک نہیں ہوئے تھے، کیونکہ اگر وہ شریک ہوئے ہوتے تو خود ان کی نماز میں مونس کی جوابی شرکت ایک اخلاقی فرض کی ادائی کی حیثیت سے ضروری اور متوقع ہوتی، البتہ ان کی عدم شرکت کو اہل شہر "نہایت ناپسند" کرتے، تاہم یہاں یہ سوال ذہن میں آ سکتا ہے کہ جب دبیر انیس کی میت پر جا چکے تھے تو ان کی نماز میں مونس کی شرکت ایک عام متوقع بات کے بجائے خاص اور بہت پسندیدہ بات کیوں قرار پائی؟ اس کا جواب یہی سمجھ میں آتا ہے کہ نماز جنازہ اور تدفین

وغیرہ کے موقعوں پر شرکا کے مجمعے میں باہمی گفتگوؤں اور میت کے بارے میں ادھر ادھر کی باتوں کی گنجائش زیادہ رہتی ہے۔ بہت ممکن تھا کہ نماز جنازہ کے قبل یا بعد مونس کے سامنے کوئی دبیر یہ جذبات کی رو میں آکر کچھ ایسی بات کہہ بیٹھتا جو ماحول کو مکدر کر دیتی۔ شاید ایسے ہی اندیشے کے تحت دبیر انیس کی تعزیت کو اس وقت گئے جب میت سامنے موجود تھی اور اس سوگوار ماحول میں کسی تلخ گفتگو کا چھڑنا تقریباً غیر ممکن تھا۔ مونس نے ایک قدم آگے بڑھ کر دبیر کی نماز جنازہ میں شرکت کا خطر کیا اور ان کا یہ اقدام شہر والوں کو غیر متوقع اور بہت اچھا معلوم ہوا۔ اس طرح یہ دونوں شرکتیں معرکے کی سنگینی کا اندازہ کراتی ہیں۔

حکیم سید علی کے نام مونس کے خط میں جھلکتا ہوا معذرتی انداز پہچانا جا سکتا ہے۔ وہ دبیر کی نماز جنازہ میں اپنی شرکت کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ یہ کام ثواب سے خالی نہ تھا۔ گویا ان کا شریک ہونا ایسا ہی تھا جیسے کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کی نماز جنازہ میں حصول ثواب کی غرض سے شرکت کرے۔ لیکن یہ شرکت دبیریوں کی طرف انیسی جماعت کے ممتاز ترین رکن کی مصالحتی پیش قدمی بھی تھی۔ اور یہ مصالحتی کارروائی حکیم سید علی کے سے زبردست انیسیے کو ناگوار بھی ہو سکتی تھی۔ اسی لیے مونس نے ان کو یہ بتانا ضروری سمجھا کہ یہ ثواب کا کام تھا، اور یہ بھی کہ اسے پسند کیا گیا۔

مونس خاندان انیس میں سب سے موہنی اور مرنجاں مرنج شخصیت کے مالک تھے، اور اگرچہ سلام کے قطعے میں انھوں نے اوج پر سخت چوٹیں کی تھیں، لیکن دبیر کی وفات کے بعد ہمیں اوج کے ساتھ ان کا رویہ شفقت اور مہربانی کا نظر آتا ہے۔ دبیر کی وفات کے کوئی سوا مہینے بعد ۱۷ اپریل ۱۸۷۵ کو داروغہ میر واجد علی تسخیر (شاگرد دبیر) کے یہاں محفل میلاد میں اوج نے اپنا کہا ہوا مسدس مولود پڑھا جس کا پہلا بند یہ تھا:

گردش ہے آج ساغر صہبائے طور کی　　　نہریں چھلک رہی ہیں شراب طہور کی
عنبر فشاں شمیم ہے گیسوئے حور کی　　　جھونکے نسیم کے ہیں کہ موجیں ہیں نور کی
روشن زمیں ہے نور رسالت مآب سے
ذرے ملا رہے ہیں نظر آفتاب سے

اودھ اخبار کا نامہ نگار اس محفل کی خبر دیتے ہوئے بتاتا ہے کہ سامعین میں "جناب...... مونس بھی تشریف فرما تھے...... نہایت تعریف فرمائی۔" (معاصر۔۱)

باپ کی وفات کے بعد اوج بے سہارا سے ہو گئے تھے۔ چھوٹے بھائی عطارد کی وفات کے بعد وہ دبیر کی تنہا اولاد نرینہ تھے۔ ادھر انیس کا بھرا پرا کنبہ موجود تھا (دو بھائی، تین بیٹے وغیرہ)۔ اس صورت حال میں مونس کا مشفقانہ رویہ ان کے لئے نعمت تھا۔ لیکن داروغہ واجد علی کے یہاں کی محفل کے سات ہی مہینے بعد ایک دن مونس کے سینے میں درد اٹھا اور وہ دیکھتے دیکھتے ختم ہو گئے۔ اوج نے ان کی وفات کا طویل قطعہ تاریخ (کم سے کم بائیس شعر کا) کہا۔ اس قطعے کے کچھ شعر درج ذیل ہیں:

برخے از احوال ما بشنوز گوش ہوش و عقل
آں کہ (ما) ہم پیش ازیں بودیم خوش دل شادماں

دفعتاً صد کوہ غم افتاد برسر وانصیب
کاں (الم) کاہیدہ ایں جسم زارو ناتواں

فی المثل یک دانہ ام در آسیاے ہفت چرخ
ہستی من در جہاں گویا کہ در دنداں زباں

اولاً از والد مغفور خود گشتم جدا
آں کہ بودہ افتخار و افتخار شاعراں

ثانیاً از (فرقت) مونس شدم اندوہ گیں
حیف آں یک مونس من بود در ہندوستاں

اے بسا دشوار شرح انتقال آں شفیق
چوں برادر بر من بے چارہ بود او مہرباں

(بیاض سید علی نقی مجتہد، ورق ۷۶ اب)

(مفہوم: میرا کچھ حال سنو، کہ اس سے پہلے میں بھی خوش و خرم تھا۔ اچانک مجھ پر غم کے سو پہاڑ ٹوٹ پڑے اور اس صدمے نے میرے جسم زار کو گھلا کر رکھ دیا۔ میں افلاک کی چکی میں ایک دانے اور دانتوں کے بیچ میں زبان کی طرح ہو گیا ہوں۔ پہلے تو میں والد مغفور سے بچھڑا جو فخر شعرا تھے، پھر مونس کی فرقت نے مجھے اندوہ میں مبتلا کر دیا۔ افسوس، ہندوستان میں وہی ایک میرے مونس تھے۔ ایسے شفیق کی رحلت کا بیان بہت دشوار ہے۔ مجھ بے چارے پر تو وہ بھائی کی طرح مہربان تھے)

اس طرح مونس اور اوج کی حد تک یہ معرکہ دبیر کی وفات کے ساتھ ختم ہو گیا تھا، لیکن کتابی معرکہ انیس و دبیر پورے کا پورا انیس و دبیر کی وفات کے برسوں بعد گرم ہوا۔

۷۔ کتابی معرکہ

انیس و دبیر کی زندگی تک معرکہ زبانی مباحثوں اور شاعرانہ نوک جھونک کی صورت میں گرم رہا اور دبیر کی وفات کو ابھی چار سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ عبدالغفور خان نساخ کی کتاب "انتخاب نقص" سامنے آگئی (جنوری ۱۸۷۹)۔ اس میں انیس و دبیر دونوں کے کلام میں طرح طرح کے نقائص دکھائے گئے تھے۔ ایک بنگالی مصنف کا لکھنؤ کے دو اساتذہ فن کی زبان وغیرہ پر اعتراض کرنا سخت رد عمل کا باعث ہوا اور نساخ کے جواب میں کتابوں کا ایک سلسلہ سامنے آگیا۔ یہ بھی ایک بڑا معرکہ تھا جس نے کتابی معرکہ انیس و دبیر کو کچھ مدت تک چھڑنے سے روکے رکھا اور اس سلسلے کی صرف ایک کتاب "تنقید آب حیات" سامنے آئی، لیکن اس کا تعلق انیس و دبیر کے کلام سے نہیں بلکہ "آب حیات" میں درج حالات دبیر سے ہے۔ البتہ "انتخاب نقص" کے اٹھائیس سال بعد ۱۹۰۷ء میں شبلی کی "موازنہ انیس و دبیر" نے کتابی معرکے کا باقاعدہ آغاز کیا۔ موازنے اور اس کے جوابوں کے علاوہ بھی اس سلسلے میں مختلف کتابیں لکھی گئیں۔ سب ملا کر مندرجہ ذیل کتابیں ہمارے علم میں آسکی ہیں:

۱۔ تنقید آب حیات — میر محمد رضا ظہیر

۲۔ موازنہ انیس و دبیر — شبلی نعمانی

۳۔ تردید موازنہ — شیخ محمد جان عروج اور حسن رضا

۴۔ ردالموازنہ	میر افضل علی ضو
۵۔ ردواقعات انیس	سردار میرزا
۶۔ حیات دبیر	سید افضل حسین رضوی ثابت لکھنوی
۷۔ حیات دبیر پر ایک نظر	سید حسین رضوی میر ٹھی
۸۔ تنبیہ	فقیر علی عاقل ایوبی انصاری
۹۔ المیزان	سید نظیر الحسن فوق مہابنی
۱۰۔ جواب موازنہ	سید ذوالفقار حسین جون پوری
۱۱۔ میر مونس اور حیات دبیر	سید محمد عبدالرسول شاکی
۱۲۔ شکوہ شاکی	سید سرفراز حسین رضوی خبیر لکھنوی

موازنہ انیس ودبیر اور اس کی جوابی کتابیں اس معرکے میں خاص اہمیت رکھتی ہیں اس لئے ان کا ذکر ہم ایک سلسلے سے کریں گے۔ ان سے پہلے دوسری کتابوں کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

(۱) تنقید آب حیات

(میر محمد رضا ظہیر، اردو پریس لکھنؤ، سال طباعت ۱۸۸۵ء اور ۱۸۹۳ء کے درمیان)

سید افضل حسین ثابت کے نانا سید محمد رضا ظہیر، شاگرد دبیر، کی وفات ۱۸ شوال ۱۳۱۰ھ (۷ مئی ۱۸۹۳ء) کو نوے یا سو سال کی عمر میں ہوئی۔ (دربار حسینؑ ص ۹۴)۔ اس حساب سے وہ دبیر کے تقریباً ہم عمر یا ان سے آٹھ دس سال بڑے تھے۔ اپنی کتاب میں وہ بتاتے ہیں:

"میں وہ شخص ہوں کہ اکثر معاملات مرزا صاحب مرحوم میں گیارہ برس کے سن سے شریک رہا ہوں۔" (ص ۲)

ظہیر کو دبیر کے بہت سے حالات کا ذاتی علم تھا اور ثابت نے "حیات دبیر" میں ان کے

حوالے سے متعدد واقعات درج کیے ہیں۔ "تنقید آب حیات" میں ظہیر نے دبیر کے متعلق محمد حسین آزاد کی "آب حیات" کے بعض بیانوں کی تردید یا تصحیح کی ہے۔ کتاب کے سرورق کی عبارت درج ذیل ہے:

"جاء الحق وزہق الباطل ان الباطل کان زہوقا

تنقید آب حیات

بہ احوال

استاد الکل فی الکل جناب مرزا دبیر صاحب قبلہ طاب ثراہ

مولفہ

معدن فصاحت مخزن بلاغت جناب میر محمد رضا صاحب

تلمیذ جناب مغفور موصوف

اردو پریس لکھنؤ گولا گنج میں چھپ کر شائع ہوا۔"

کتاب کی تصنیف اور طباعت کی تاریخیں درج نہیں ہیں۔ "آب حیات" کا دوسرا ایڈیشن، جس میں انیس و دبیر کے حالات کا اضافہ ہے، ۱۸۸۳ء (۱۳۰۱-۱۳۰۰ھ) میں چھپا (محمد حسین آزاد)۔ "تنقید آب حیات" کی پشت پر شاعری کے ایک گلدستے "نغمہ بہار" کا اشتہار ہے۔ یہ گلدستہ ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۵ء) سے ہر مہینہ شائع ہو رہا تھا۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ "تنقید آب حیات" کی تصنیف ۱۸۸۳ء (اشاعت "آب حیات") کے بعد، اور طباعت ۱۸۸۵ء (آغاز "نغمہ بہار") کے بعد مگر ۲ مئی ۱۸۹۳ء (وفات ظہیر) سے قبل ہوئی۔

کتاب کے آغاز میں ظہیر لکھتے ہیں:

"تذکرہ آب حیات نظر نحیف سے گزرا۔ بعض مقامات پر اصل واقعات کی غلطیاں...... دیکھ کر کمال حیرت ہوئی...... مصنف موصوف نے بڑی بڑی جسارتیں کی ہیں...... احوال...... جناب مرزا دبیر صاحب مرحوم میں عجب عجب حکایتیں طبع ایجاد تحریر فرمائی ہیں...... مرزا صاحب کے اکثر معاند تھے اور ہیں، لیکن کسی سے کبھی ان حکایات موضوعہ کا ایک حرف بھی

نہیں سنا۔" (ص ۲۔۱)

ظہیر کے اعتراضات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ آزاد بتاتے ہیں کہ دبیر ۱۸۵۸ء میں مرشد آباد بلائے گئے۔ ظہیر کا کہنا ہے:

"مرشد آباد جانا کیسا کہ مرزا صاحب نے تامدت العمر اس شہر کا نقشہ بھی کسی کاغذ پر کھنچا ہوا نہیں دیکھا۔" (ص ۲)

۲۔ میر محسن علی نے اپنے تذکرے "سراپا سخن" میں دبیر کو ایک جگہ "ولد مرزا غلام حسین متعلقان آغا جان کاغذ فروش" اور دوسری جگہ "ولد مرزا غلام حسین کاغذ فروش" لکھا ہے۔ آزاد بتاتے ہیں کہ محسن نے ان کے والد کا نام ایک جگہ مرزا آغا جان کاغذ فروش لکھا ہے۔ ظہیر آزاد کی اس غلطی کی نشاندہی کرتے اور مرزا غلام حسین کا کچھ حال لکھتے ہیں۔ (ص ۵۔۴)

۳۔ آزاد نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ دبیر کو ابتدائے مشق میں اپنے استاد کی ایک اصلاح درست نہیں معلوم ہوئی تو وہ ناسخ کے پاس پہنچے۔ اثنائے گفتگو میں ناسخ کو غصہ آگیا اور وہ لکڑی لے کر اٹھے تو دبیر وہاں سے بھاگ گئے۔ ظہیر اس واقعے کی تردید میں کہتے ہیں:

"ابھی مثل میرے اس زمانے کے لوگ کچھ زندہ بھی ہیں اور وہ سب شاہد ہیں کہ مرزا صاحب مرحوم اس محلے میں جہاں ناسخ مرحوم رہتے تھے، کبھی نہیں گئے اور نہ کہیں اور موقع مباحثے و مکالمے کا آیا۔" (ص ۶)

۴۔ آزاد بتاتے ہیں کہ آتش نے ایک مجلس میں دبیر کا مرثیہ سن کر اسے لندھور بن سعدان کی داستان سے مشابہ ٹھہرا لیا تھا۔ ظہیر اس کی تردید کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ خود اس مجلس میں شریک اور پیش خواں تھے جس میں دبیر نے اپنا غیر منقوط مرثیہ پڑھا۔ آتش نے اسے سن کر بہت تعریف کی تھی۔ (ص ۸۔۶)

۵۔ آزاد نے "ہم طالع ہما مراد ہم رسا ہوا" کو دبیر کا غیر منقوط مرثیہ بتایا ہے۔ ظہیر بتاتے ہیں کہ یہ مرثیہ دبیر کا نہیں، (محمد تقی خاں) اختر کا ہے۔ دبیر کا غیر منقوط مرثیہ "مہر علم

سرور اکرم ہو اطلاع" ہے۔ (ص ۸)

۶۔ آزاد نے دبیر کی تاریخ وفات ۲۹ محرم لکھی ہے۔ ظہیر کا کہنا ہے کہ "اس روز تو وہ زندہ تھے۔ ہاں، وہ دن گزر کر شب سلخ محرم صبح ہوتے وفات پائی۔ اور اسی روز، کہ تیسویں محرم کی تھی،...... دفن ہوئے۔" (ص ۷)

۷۔ دبیر اور ان کے استاد ضمیر کے درمیان بے لطفی کی جو تفصیل آزاد نے لکھی ہے، ظہیر اسے غلط قرار دیتے اور اصل واقعے کی تفصیل لکھتے ہیں کہ ضمیر کے ایک شاگرد عابد علی بشیر نے دونوں کے درمیان غلط فہمی پیدا کر دی تھی۔ بعد کو دونوں میں صفائی ہو گئی تھی۔ ظہیر یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس موقع پر وہ خود موجود تھے جب ضمیر کے یہاں بشیر وغیرہ دبیر پر آوازے کس رہے تھے۔ (ص ۱۴۔۸)

تخمیناً ساڑھے پانچ ہزار لفظوں کی "تنقید آب حیات" دبیر کے حالات کا اچھا ماخذ ہے اور محض اس بنا پر کہ اس میں آزاد کے کچھ بیانوں کی تردید اور تصحیح کی گئی ہے، اس کو معرکہ انیس و دبیر کے سلسلے کی کڑی سمجھنا شاید درست نہ ہو، لیکن ظہیر کے اس یقین نے کہ آزاد نے دبیر پر بہتان لگائے ہیں، اس کتاب کو اس معرکے کا جز بنا دیا ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ آزاد انیسیے ہیں۔ ظہیر کے نواسے ثابت کو بتایا گیا تھا کہ "دہلی میں قبل غدر ۱۸۵۷ء اپنے گھر کی مجلسوں میں جناب آزاد مرحوم جناب میر صاحب ہی کے مرثیے پڑھا کرتے تھے"۔ (حیات دبیر (۱) دیباچہ ص ۲۰) اور یہ کہ اسی زمانے میں آزاد کے والد "بڑی سیر چشمی اور خوش اعتقادی سے مجلس کرتے تھے۔ اس مجلس میں آزاد مرحوم میر صاحب کا مرثیہ پڑھتے تھے۔ اور اور ذاکر کوئی میر صاحب کا، کوئی مرزا صاحب کا کلام پڑھتا تھا۔" (ایضاً ص ۴۸) گویا آزاد دبیر کا کلام پڑھنے سے گریز کرتے تھے۔ اس طرح "تنقید آب حیات" ایک مخالف دبیر انیسیے کو ایک دبیریے کے جواب کی حیثیت سے لکھی گئی۔

ظاہر ہے کہ ظہیر آزاد کے مقابلے میں دبیر کے حالات سے بہت زیادہ باخبر تھے اور انہوں نے جو واقعات بیان کیے ہیں، خصوصاً وہ واقعات جو ان کے چشم دید ہیں، انہیں صحیح نہ سمجھنے کی

کوئی وجہ نہیں ہے۔ البتہ آزاد کی تردید کرتے وقت وہ کچھ جوش میں آکر یہاں تک دعویٰ کرنے لگتے ہیں کہ دبیر کی کبھی کہیں ناسخ سے گفتگو نہیں ہوئی اور دبیر کبھی ناسخ کے مسکونہ محلے میں گئے تک نہیں۔ اس قسم کی باتیں یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتیں۔

ظہیر کا جوش کہیں کہیں ان کے لہجے کو غیر معتدل کر دیتا ہے، مثلاً

"یہ حکایت سراسر جھوٹ کا پوٹ ہے۔" (ص ۲)

"(دبیر کے والد کا نام غلط لکھنے کے سلسلے میں) یہ نام اس شخص کے باپ کا ہوگا جو اس کا مدعی قرار پائے۔" (ص ۴)

"بھئی واہ، کیا گڑھی ہے ...... یہ حکایت موضوعہ بیر خارا کے پاک شہدوں کی بولیوں کا سماں دکھاتی ہے۔" (ص ۵)

"اس جسارت کو دیکھ کر نہایت حیرت ہوتی ہے۔ شاید کلام اللہ میں دربارہ کاذبین کچھ حکم نہیں آیا ہے۔" (ص ۹)

ظہیر کے مقابلے میں ثابت کا رویہ اس سلسلے میں بہت متوازن اور سلجھا ہوا ہے بلکہ انہوں نے آزاد کی جانب سے صفائی پیش کی ہے۔ یہ بتانے کے بعد کہ آزاد اپنے گھر کی مجلس میں انیس ہی کے مرثیے پڑھتے تھے، ثابت لکھتے ہیں:

"مگر آزاد ایسے آزاد خیال بزرگ سے ہرگز یہ امید نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ جان بوجھ کر، میر صاحب کے طرف دار ہونے کے سبب سے، مرزا صاحب کے حالات بھی غلط لکھیں۔ آخر اہل علم ہیں۔ دل میں سوچا کہ اس میں کوئی لم ہے۔ حضرت آزاد مرحوم کو میں نے کوٹے سے خط لکھ کر آگاہ کیا کہ مرزا دبیر مرحوم کے جو حالات میں نے بزرگوں (اہل لکھنؤ) سے سنے ہیں (کہ جن میں سے بعض حضرات اب تک زندہ ہیں) اکثر یہ حالات مندرجہ "آب حیات" ان کے بالکل برخلاف اور اس لئے غلط ہیں۔ ان مرحوم نے مجھے جواب دیا کہ جن صاحب سے حالات دبیر کو خط لکھ کر میں نے پوچھا۔ انہوں نے (اہل لکھنؤ وغیرہ میں سے) کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ خیر غزل گو شعرا کے تو کچھ حالات ملک سے ملے بھی مگر مرثیہ گویوں کا تو کوئی حال

ہی نہیں بتاتا۔ میں نے جو کچھ سنا، لکھ دیا۔ مگر مجھے اس کی صحت پر نہ بھروسا ہے نہ اصرار۔ تم صحیح حالات لکھ بھیجو۔ میں شکریے کے ساتھ آئندہ (ایڈیشن) چھپنے پر وہ حالات لکھ دوں گا۔"

(دیباچہ حیات دبیر)

"دربار حسینؑ" میں ثاقب بتاتے ہیں کہ اس سلسلے میں انہوں نے آزاد کو جو کارڈ لکھا تھا اس کے جواب میں آزاد نے انہیں کئی کارڈ لکھے تھے (ص ۹۳)۔ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ آزاد نے ثاقب کو دبیر کے صحیح حالات بھیجنے کی بار بار یاد دہانی کی۔ ثاقب مزید لکھتے ہیں:

"اب میں اس فکر میں تھا کہ رخصت لے کر لکھنؤ جاؤں تو معمر آدمیوں سے مزید صحت کر کے صحیح حالات جناب آزاد کو لکھ بھیجوں...... کئی برس کے بعد جو میں لکھنؤ گیا تو معلوم ہوا کہ حضرت آزاد اب آزاد نہیں رہے بیاد جنوں ہو گئے۔" (دیباچہ)

پھر ثاقب خود اپنے تلخ تجربوں کا ذکر کرتے ہیں کہ انہوں نے مرثیہ گویوں کا تذکرہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا جسے دوسروں کا تعاون نہ ملنے کی بنا پر ترک کر دیا۔

(۲) ردواقعات انیس

(سردار میرزا، اصح المطابع، لکھنؤ۔ طباعت ۱۹۰۸ یا بعد)

انیس کے حالات اور کلام پر سید مہدی حسن احسن کی کتاب "واقعات انیس" ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔ سردار میرزا نے اس کے بعض بیانوں کی تردید میں "ردواقعات انیس" لکھی۔ تخمیناً آٹھ ہزار الفاظ کی اس کتاب کے سرورق کی نقل حسب ذیل ہے:

"جاء الحق وزہق الباطل ان الباطل کان زہوقا

بہ افضال الٰہی دریں زمان سعادت اقتران

ردواقعات انیس

مولفہ ادیب باکمال و خطیب بے مثال، حاوی علوم معقول و منقول
جناب سردار میرزا صاحب خلف حجتہ الاسلام حضرت مفتی
نواب مرزا صاحب قبلہ مرحوم ساکن کاظمین شریفین لکھنؤ
در مطبع اصح المطابع تھوئی ٹولہ طبع شد"

شروع میں سردار میرزا لکھتے ہیں:

"واقعات انیس میں علاوہ اغلاط لفظی کے اکثر واقعات سراسر غلط ہیں جن کی صحت عقل سلیم پر لازم ہے تاکہ قوم مغالطے میں نہ پڑے (ص ۳)۔ پھر احسن کی بعض لفظی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہیں، اور اس کتاب کے تالیف احسن ہونے کو اس طرح مشکوک کرتے ہیں: "دیکھنے والوں میں سے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کتاب مولف صاحب کی تالیف کی ہوئی نہیں، اور نہ ہم اس جھگڑے میں پڑنا چاہتے ہیں۔ بلکہ ہم پکار کر کہتے ہیں کہ بھائیو، یہ کتاب انہیں کی ہے۔" (ص ۴)

"اغلاط واقعات انیس" سرخی کے تحت احسن کے کچھ بیانات کی اس طرح تردید کی گئی ہے:

۱۔ سلام "زمینوں کو": احسن کا یہ کہنا غلط ہے کہ انیس کے سلام کی زمین میں دبیر نے سلام کہا تھا۔ البتہ اوج نے کہا تھا (ص ۹۔۶)۔ اس کی تفصیل اس سلام کے قضیے کے سلسلے میں بیان ہو چکی ہے۔

۲۔ احسن کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ انیس کے مصرعے "جس طرح سے نغمے کی صدا تار پہ دوڑے" میں "نغمے" کے بجائے "بجلی" کا لفظ ہے۔ "سیکڑوں گوش حق نیوش ابھی پردہ ہستی میں ایسے ہیں کہ انہوں نے خود میر صاحب کی زبان سے وہی لفظ "نغمے" سنا تھا" (ص ۱۲۔۱۱)۔

۳۔ احسن کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ انیس نے بزرگان دین اور خاندان رسالت کے سوا دولت مندوں کی مداحی نہیں کی۔ انیس نے آغا علی خاں ناظم، دیانت الدولہ کی مدح میں شعر کہے ہیں اور مختار الملک اور والی دکن کی تعریف میں تو ان کی دو رباعیاں خود احسن نے

"واقعات انیس" میں درج کی ہیں (ص ۱۲۔۱۱)۔ آگے بڑھ کر بتاتے ہیں :

"آغا علی خاں صاحب ناظم مرحوم نے ایک لڑکا سقے کا، جو لاوارث تھا، تھانہ گولا گنج سے لے آئے تھے، اسے پالا تھا۔ اتفاقاً وہ مر گیا۔ اس کے سوم میں باوجود عدم تعارف و ملاقات میر انیس صاحب و میر نواب صاحب مونس شریک مجلس سوم ہوئے تھے۔ ہم بھی مجلس میں تھے۔ ہمارے پہلو میں دونوں صاحب تا ختم مجلس بیٹھے رہے۔

ناظم صاحب کیلئے دعائیہ مقطع :

خدا آباد رکھے اے انیس آغا علی خاں کو اگر کچھ قدر ہے تو انکے یاں صاحب کمالوں کی

......اسی زمانے میں تصنیف ہوا تھا اور پڑھا گیا تھا۔" (ص ۱۸)

"عدم تعارف" کا سبب سردار میرزا یہ بتاتے ہیں کہ آغا علی خاں دبیر سے "کمال عقیدت و ربط" رکھتے تھے اور انھوں نے جب بھی کوئی مجلس کی اس میں دبیر کو پڑھوایا نہ کہ انیس کو (ص ۱۸)۔ یعنی مذکورہ بالا مجلس بھی دبیر نے پڑھی ہو گی۔

۴۔ احسن کا کہنا ہے کہ پہلے مرثیوں کے بند چار چار مصرعے کے ہوتے تھے، انیس نے مسدس بندوں کو رواج دیا۔ یہ غلط ہے۔ "سودا کے قبل کے مرثیے چھ مصرائی موجود ہیں" (ص ۱۲)۔

۵۔ احسن واجد علی شاہ کی والدہ ملکہ کشور کے یہاں انیس و دبیر کی یک جا خوانندگی کا ذکر کرتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس مجلس میں دبیر درباری لباس پہن کر اور انیس سادہ لباس میں منبر پر گئے تھے، وغیرہ۔ یہ روایت سراسر غلط ہے۔ "ابھی اس زمانے کے لوگ زندہ ہیں جو حلفاً بیان کرتے ہیں کہ مرزا صاحب تا مدت العمر ملکہ کشور صاحب کے یہاں کبھی نہیں پڑھے......نہ کسی بادشاہ کے دربار میں، نہ کسی دولت مند کی سرکار میں لباس درباری سے گئے" (ص ۱۳۔۱۲)۔ اس کے بعد تفصیل سے بیان کیا ہے کہ مرزا اوج نے بھی کلکتے اور حیدرآباد میں درباری لباس نہیں پہنا اور دونوں جگہ کے امرا نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اسی طرح رام پور میں بھی خاندان دبیر کی بڑی قدر کی گئی۔ کتاب کا سب سے طویل حصہ یہی ہے لیکن یہ اصل موضوع سے کچھ ہٹا ہوا ہے۔

۶۔ احسن نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک موقع پر انیس نے ایک رئیس کو سلام کرنے کا موقع نہیں دیا اور اس کی طرف سے منھ پھیر لیا اس لئے کہ وہ اس رئیس کو سلطنت کا غدار سمجھتے تھے۔ احسن اس ضمن میں بتاتے ہیں کہ انیس کا "قول تھا کہ گناہ گاروں کے مکروہ چہرے کو دولت مندی کی نقاب نہیں چھپا سکتی"۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد بطور مثال ایک ادنیٰ طبقے کے دولت مند کا ذکر کیا گیا ہے جو "اپنی لاڈلی بیٹی کے لئے ایک شریف خاندان کا سید شوہر تجویز کرتا ہے۔" "اپنے خاندانی رشتہ داروں پر حقارت سے نظر کرتا ہے..... وغیرہ۔ یہ ایک مکروہ تصویر ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ احسن کا اشارہ کسی خاص شخص کی طرف ہے۔ یہ اشارہ غالباً اس زمانے کے لحاظ سے بہت واضح تھا اور سردار میرزا سمجھ گئے تھے کہ وہ خاص شخص کون ہے، لیکن انھوں نے احسن کے اس بیان کو بھی انیس کا قول سمجھا اور لکھا:

"اس حکایت کی داد وارثان منسوب الیہ کو دینا چاہئے۔ اگرچہ نام نہیں لیا ہے لیکن بہت بڑا حملہ اشارات خاص سے ایک ذی عزت شخص پر کیا گیا ہے جس سے میر انیس ایسے مہذب پر غیبت و بد اخلاقی کا حرف آتا ہے۔ استغفر اللہ ربی من کل ذنب۔ ہرگز میر صاحب ایسے نہ تھے کہ وہ یہ کلمات غیبت فرماتے۔" (۱۸۔۱۷)

۷۔ "اہل شہر کا گمان" عنوان کے تحت مصنف بتاتے ہیں کہ آغا علی خاں ناظم کے لے پالک کی مجلس سوم میں انیس کی شرکت کا زمانہ وہ تھا جب انھیں وقف شاہ نجف سے ملنے والی تنخواہ موقوف ہو گئی تھی۔ لکھنؤ کے "ناتواں بیں" لوگوں نے گمان کیا کہ انیس چاہتے ہیں کہ آغا علی خان نجف کے متولی حکیم بندہ مہدی سے سفارش کر کے ان کی تنخواہ جاری کرا دیں۔ احسن نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے "وہ محض غلط ہے" (ص ۱۹)۔

۸۔ "شکر رنجی میر انیس صاحب با مفتی میر عباس صاحب قبلہ" کی سرخی دے کر احسن کی اس روایت کی تردید کی گئی ہے کہ انیس مفتی صاحب سے آزردہ ہو گئے تھے جس پر مفتی صاحب نے ایک طویل معذرتی قطعہ لکھا۔ سردار میرزا کا کہنا ہے کہ اس قطعے کے تین شعروں میں عروضی انحراف ہے اس لئے یہ مفتی صاحب کا نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ "افقہ

واعلم" تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انیس مفتی صاحب کے شاگرد تھے اور مرثیہ و سلام پر ان سے اصلاح لیتے تھے (ص ۲۵۔ ۲۴)۔

۹۔ احسن نے لکھا ہے کہ انیس و نفیس ایسی باریک ڈاڑھی کترواتے تھے کہ وہ منڈی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سردار میرزا کا کہنا ہے کہ "دونوں صاحبوں کی ڈاڑھی نہیں تھی" (ص ۲۵)۔

۱۰۔ احسن کی یہ روایت بھی صحیح نہیں ہے کہ انیس نے عون و محمد کے حال میں اپنے مرثیوں کی تعداد دو سو بتائی تھی۔ انیس کے کل ایک سو پانچ مرثیے جمع ہو سکے ہیں۔ "اگر اس تعداد سے زیادہ ہوں گے تو زمانہ غدر میں تلف ہو گئے ہوں گے جن کا ملنا اب غیر ممکن ہے اور ثبوت عنقا" (ص ۲۶)۔

۱۱۔ احسن کا بیان ہے کہ غالب نے انیس کی فرمائش پر مرثیے کے تین بند کہہ کر انیس کے پاس "اصلاح کو روانہ کئے" اور مرثیہ گوئی میں اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ "اصل بات تو یہ ہے کہ یہ آپ ہی کا کام ہے۔" سردار میرزا اس کی تردید کرتے ہیں اور صفیر بلگرامی کے تذکرے "جلوہ خضر" کے حوالے سے غالب کا یہ قول نقل کرتے ہیں: "واقعی یہ (مرثیہ گوئی) حق مرزا دبیر کا ہے۔ دوسرا اس راہ میں قدم نہیں رکھ سکتا۔" اور اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ

"مرزا غالب مرحوم کے نزدیک سوا مرزا دبیر کے اور کسی کا وجود مرثیہ گوئی میں نہ تھا۔" (ص ۲۹۔ ۲۸)

ظہیر کے مقابلے میں سردار میرزا کا لہجہ معتدل ہے۔ وہ اختلاف میں اشتعال کا شکار نہیں ہوتے اور "یہ قول محض غلط ہے۔" (ص ۱۱) "یہ قول سراسر غلط ہے"۔ (ص ۱۲)۔ "مولف صاحب کو خود اپنا لکھا ہوا یاد نہیں رہتا" (ص ۱۲) سے آگے نہیں بڑھتے، البتہ انیس و دبیر کی یک جا خواندگی کی روایت سے اختلاف میں وہ ظہیر کی طرح سخت لفظ استعمال کرتے ہیں:

"استغفر اللہ تعالیٰ، جھوٹ اور اس قدر جھوٹ! یہ حکایت موضوعہ جھوٹ کا پوٹ ہے۔"

(ص ۱۳)

(۳) حیات دبیر پر ایک نظر

(سید حسین رضوی میرٹھی۔ مفید عام پریس، لکھنؤ ۱۹۱۴ء)

سید حسین رضوی میرٹھ کی ممتاز ادبی شخصیت سید محمد مرتضیٰ بیان و یزدانی میرٹھی (وفات ۱۹۰۰ء) کے بھائی تھے اور شرف تخلص کرتے تھے۔ (بیان میرٹھی، حیات وشاعری، ص ۱۶)۔ وہ بتاتے ہیں کہ یہ کتاب انہوں نے دہلی میں لکھی ہے جہاں وہ علاج کی غرض سے مقیم ہیں اور "ساتھ کوئی کتاب یا یادداشت نہیں ہے...... جو کچھ لکھا وہ محض یاد سے لکھا ہے۔" (ص ۱۰)

تخمیناً نو ہزار لفظوں کی اس کتاب کا سرورق اس طرح ہے:

"حیات دبیر

پر

ایک نظر

حسب فرمائش

مصنف جناب سید حسین رضوی میرٹھی

مفید عام پریس پاٹانالہ لکھنؤ میں

بہ اہتمام محمد علی طبع ہوئی"

ذخیرہ ادیب میں اس کتاب کا جو نسخہ ہے وہ لکھنؤ کے ممتاز شاعر جاوید کو پیش کیا گیا تھا۔ اس کے سرورق پر (غالباً خود مصنف کے قلم سے) "بہ جناب سید مدوح کا ظم صاحب جاوید"

لکھا ہوا ہے۔

افضل حسین ثابت کی "حیاتِ دبیر" جلد اول، جو ۱۹۱۳ میں طبع ہوئی، نہ صرف دبیر بلکہ اردو کی بہترین سوانح عمریوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ سید حسین کی کتاب "حیات دبیر" کے ایک سرسری جائزے کی حیثیت رکھتی ہے۔

مصنف کا کہنا ہے کہ اگرچہ ثابت نے کھل کر نہیں بتایا ہے کہ وہ انیس و دبیر میں سے کس کے طرف دار ہیں لیکن دراصل "مولف کی یہ کوشش ہے کہ میرزا دبیر میر انیس سے افضل قرار پائیں۔" (ص ۳۔۲)۔ مصنف کی بحثوں کا خلاصہ یہ ہے:

"میرزا دبیر مرحوم انسان کے لباس میں فرشتہ تھے...... جہاں تک مجھے علم ہے ان کے معاصرین میں کوئی اس مرتبے کا بزرگ نہیں تھا...... نہایت ذکی اور ذہین تھے۔" لیکن ضروری نہیں کہ ہر ذہین آدمی شاعر بھی ہو۔ (ص ۳)

انھیں دبیریوں کی آویزشوں کی وجہ سے دونوں شاعروں کے موازنے کا رجحان پیدا ہوا، "لیکن بدقسمتی سے موازنہ کرنے والے ایسے شخص تھے جو موازنہ کرنے سے پہلے ان دونوں صاحبوں کا کلام دیکھ کر یا کسی اور وجہ سے کچھ نہ کچھ رائے قائم کر چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس کی رائے جن صاحب کی نسبت اچھی ہو چکی تھی اس نے ان صاحب کا عمدہ کلام انتخاب کر کے دوسرے کے برے کلام کے مقابل میں رکھ دیا اور اپنی رائے کی اس طرح تائید کر کے اس کا اظہار کر دیا۔ حقیقت میں یہ طریقہ موازنہ (تھوڑے منتخب کلام کے مقابلے سے) ہرگز درست نہیں ہے...... اس غلط طریقے کے اختیار کرنے سے ہر ایسے موازنہ کنندہ کو یہ موقع مل گیا ہے کہ وہ جس کا طرفدار ہے اس نے اسی کو دوسرے سے بہتر دکھایا ہے۔ مولانا شبلی کا موازنہ بھی اس عیب سے خالی نہیں ہے۔" (ص ۴۔۳)

انیس کا کلام پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ "گویا ان کو اس کے نظم کرنے میں ذرا تکلف نہیں ہوا ہے...... معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی باتیں کر رہا ہے۔" (ص ۶)

ثابت نے دبیر کے کلام پر بعض لوگوں کے اس اعتراض کا ذکر کیا ہے کہ ان کے یہاں

"بعض مضمون تو بہت بلند ہوتے ہیں مگر وہ سلسلہ ترقی مضامین کا قائم نہیں رہتا، اس کے بعد مضامین گرے ہوئے ہوتے ہیں۔" سید حسین کہتے ہیں کہ "یہ اعتراض بے بنیاد نہیں ہے۔ مجھے بھی یہ نقص مرزا صاحب کے کلام میں محسوس ہوا۔" پھر دبیر کے مطلع "کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے" پر تنقید کرتے ہیں، مثلاً یہ کہ "چرخ کہن کانپ رہا ہے" کہہ چکنے کے بعد "قصر سلاطین زمن کانپ رہا ہے" کہنے سے ترقی مضامین کا سلسلہ قائم نہیں رہا اور مضمون گر گیا۔ (ص ۸۔۶)

ثاقب دبیر کو بہترین شاعر، قدرتی شاعر اور اردو کا خدائے سخن کہتے ہیں، لیکن ان کی کتاب سے اس دعوے کی تائید نہیں ہوتی۔ انھوں نے کتاب میں دبیر کا منتخب یعنی بہترین کلام پیش کیا ہے، لیکن "مجھے اس کتاب کے اثنائے مطالعہ میں اکثر جگہ ایسا کلام ملا ہے جو میرے نزدیک قابل اعتراض ہے۔ جب بہترین کلام کی یہ حالت ہے تو بقیہ کلام کیسا ہوگا۔" (ص ۱۱۔۱۰) اس کے بعد دبیر کے قابل اعتراض کلام کے کئی نمونے دیئے گئے ہیں، مثلاً دبیر کے ایک بند میں "ان مصائب کا ذکر ہے جو اعدائے دیں کے ہاتھوں سے "رسولؐ خدا اور آل رسولؐ کو پہنچے تھے اور اس میں یہ بھی کہا ہے کہ جناب سیدہؑ نے "داغ غم احمدؐ" اٹھایا۔ "جناب سیدہؑ کی مصیبت جو بیان کی گئی ہے وہ امر خداوندی ہے، اس کا شمول اس موقع پر مناسب نہیں معلوم ہوتا" (ص ۱۱) یا مثلاً دبیر لکھتے ہیں کہ جب جناب سیدہؑ مکان سے روضہ رسولؐ پر جارہی تھیں تو ان کے پردے کی خاطر "سب نے چراغ اپنے گھروں کے بجھا دیے۔" مصنف کا اعتراض ہے کہ "جناب سیدہؑ راستے میں چل رہی ہیں، گھر کے چراغوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، ان کا ذکر فضول ہے۔" (ص ۱۳۔۱۲) یا مثلاً "جناب سیدہؑ کی کیفیت آنحضرتؐ کی وفات پر" دکھاتے ہوئے دبیر کہتے ہیں۔ "سن کم قلق زیادہ قلق سے فغاں سوا۔" اس پر سید حسین کا اعتراض یہ ہے کہ "قلق سے فغاں سوا" کہنے سے "معاذ اللہ جناب سیدہؑ پر اتہام تصنع عائد ہوتا ہے۔" (ص ۱۳)

ثاقب لکھتے ہیں کہ جب دبیر "دقیق کلام کہتے ہیں تو بڑے بڑے عالم گھنٹوں سوچا کرتے

ہیں اور ایسے ویسے کچ پینڈے تو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔" سید حسین کا ایک اعتراض تو یہ ہے کہ "کچ پینڈیا جیسے رکیک لفظ کا مرزا صاحب سے مقدس شخص کی سوانح عمری میں استعمال کرنا نہایت معیوب ہے" دوسرا یہ کہ ثاقب نے دبیر کے دقیق کلام کی نشان دہی نہیں کی ورنہ "یہ بھی معلوم ہو سکتا کہ حضرت ثاقب جس کلام کو دقیق بتلاتے ہیں وہ دراصل دقیق بھی ہے یا نہیں۔" (ص ۱۵)

سید حسین نے انیس کے کلام کی خوبیوں سے زیادہ توجہ کلام دبیر کے معایب پر رکھی ہے۔ دبیر پر اعتراضات کے ضمن میں انہوں نے کہیں کہیں انیس کا کلام پیش کر کے اسے دبیر کے کلام سے بہتر بتایا ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ دبیر قدرتی اور فطری شاعر نہیں تھے اس لئے کہ وہ عجز بیان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ "البتہ میر انیس مرحوم اس صنف مرثیہ گوئی کے نہایت اعلیٰ درجے کے شاعر تھے...... اس میں ان کا کلام سادہ، مزے دار اور موافق فطرت ہوتا ہے، اور یہی کلام کی اصلی اور پوری خوبی ہے، اس لئے ان کو اس صنف میں مرزا دبیر سے بہتر قرار نہ دینا سخت ناانصافی ہے۔" (ص ۲۱)

"حیات دبیر پر ایک نظر" معتدل لہجے اور تنقیدی مزاج کی کتاب ہے، لیکن سید حسین میر نخعی نے دو بے اعتدالیاں کی ہیں۔ ایک تو کہیں کہیں انہوں نے دبیر کے کلام پر اعتراض کرنے کے ساتھ اس کی اصلاح بھی کر دی ہے، دوسرے جا و بے جا اپنے بھائی بیان میر نخعی کا ذکر کیا ہے۔ قدرتی شاعر کی بحث میں وہ کہتے ہیں کہ انیس کی طرح "غالب، ناسخ، آتش، میر، سودا وغیرہ بھی ان اصناف سخن کے استاد کامل تھے جن میں ان کا کلام ہے...... لیکن جملہ اصناف سخن پر وہ اس طرح قادر نہ تھے، اس لئے مجھ کو ان کے قدرتی شعرا کے زمرے میں قرار دینے میں عذر ہے۔" (ص ۲۱) اور یہ کہ بیان کو جملہ اصناف سخن پر کامل قدرت حاصل تھی اور

"قدرتی شاعر کا جو معیار میرے ذہن میں ہے، اس (کے) لحاظ سے میرے علم میں ہندوستان میں چار قدرتی شاعر ہوئے ہیں: امیر خسرو، شیخ علی حزیں، سید انشا اور سید بیان یزدانی۔" (ص ۱۷)

(۴) تنبیہ (جواب "حیات دبیر پر ایک نظر")

(قاضی فقیر علی عاقل ایوبی انصاری شاگرد اوج، تصنیف ۱۹۱۴یا ۱۹۱۵)

"حیات دبیر پر ایک نظر" ایسی کتاب نہ تھی کہ دبیریوں کی طرف سے اس کا جواب نہ دیا جاتا۔ ثامت حیات دبیر کی جلد دوم (مطبوعہ ۱۹۱۵) کے ابتدایئے میں لکھتے ہیں :

"میں نے بعض احباب سے یہ خبر سنی تھی کہ میر سید حسین صاحب تحصیل دار...... "حیات دبیر" پر ایک مبسوط تقریظ تحریر فرما رہے ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی تھی کہ ان کی بدولت بہت سی غلطیوں پر میں مطلع ہو کر آئندہ اپنی تالیف کو درست کر لوں گا۔ مگر جب وہ بائیس صفحے کا چھپا ہوا رسالہ "حیات دبیر پر ایک نظر" چھپ کر میرے پاس سید صاحب موصوف کا مرسلہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ "حیات دبیر" کی وہ تقریظ نہیں ہے بلکہ سید صاحب اس بات کی کوشش فرماتے ہیں کہ ملک مان لے کہ یزدانی مرحوم دبیر و انیس کے ہم سر بلکہ قدرتی شاعر اور اس لحاظ سے ان دونوں صاحبوں سے بہتر تھے...... اگر ملک ایسا مان لے تو میرا کیا نقصان ہے، مگر افسوس کہ یہ آرزو پوری ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی...... اس آرزوے خام کے جوش میں جو کلام دبیر پر سید صاحب نے اعتراض فرمائے ہیں میں نے ان کا جواب اس لئے نہ دیا کہ معترض صاحب مغز سخن کو ہی نہیں پہنچتے۔" پھر اطلاع دیتے ہیں : "علاوہ اس کے میرے مکرم واجب احترام پیر بھائی قاضی فقیر علی صاحب عاقل ایوبی انصاری مقیم لائل پور (پنجاب) نے نہایت تحقیق و تہذیب سے اس رسالے کا جواب لکھ دیا جس کا نام "تنبیہ" ہے اور جو انشاء اللہ عنقریب چھپ کر شائع ہو گا۔" (ص ۹۔۸)

"تنبیہ" کا مطبوعہ ایڈیشن ہمارے علم میں نہیں ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ "حیات دبیر پر ایک نظر" کا یہ جواب ثامت کے ابتدایئے کی تاریخ ۲۵ ستمبر ۱۹۱۵ء تک لکھا جا چکا تھا، لیکن ہنوز غیر مطبوعہ تھا۔

(۵) میر مونس اور حیات دبیر

(سید محمد عبدالرسول شاکی، مجھو ڈسٹ پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ ۱۹۲۱)

تخمیناً ساڑھے چار ہزار لفظ کی اس کتاب کا سرورق اس طرح ہے:

"میر مونس

اور

حیات دبیر

پر محققانہ رائے

از سید محمد عبدالرسول شاکی

حسب فرمائش

جناب مرزا جعفر علی صاحب نشتر، قیمت فی جلد چار آنہ"

انیس کے چھوٹے بھائی میر نواب مونس کا ایک سلام ہے (دیوان فصاحت عنوان ۸۱۔۷۹):

غیر کی مدح کریں شہ کے ثنا خواں ہو کر مجرئی اپنی ہوا کھوئیں سلیماں ہو کر

اس زمین میں دبیر کی ایک شاگرد سلطان عالیہ سلطان (بنت نصیرالدین حیدر بادشاہ اودھ وملکہ زمانیہ) کا بھی ایک سلام ہے (دفتر ماتم جلد ۱۶ص ۱۵۹):

نام شبیر کا لے مجرئی گریاں ہو کر اشک محشر میں ملیں گے در غلطاں ہو کر

(دبیر نے اس سلام پر مصرعے لگائے ہیں۔ دفتر ماتم جلد ۱۹ص ۲۳۰۔۲۳۲)

شاکی کی کتاب کا موضوع یہی دونوں سلام ہیں۔ گفتگو کی ابتدا وہ ان سلاموں کے بارے

میں "حیات دبیر" (حصہ دوم) کے اس اقتباس سے کرتے ہیں:

"جب (سلطان عالیہ کے) اس سلام کا ذکر آگیا ہے تو ایک بات اور بھی سن لیجئے۔ مقطع میں میر مونس فرماتے ہیں:

رہبری کی جو مقدر نے تو ہم بھی مونس روضۂ شاہ پہ جائیں گے خراساں ہو کر

پہلے میری سمجھ میں نہ آتا تھا لفظ "بھی" کی کیا ضرورت تھی۔ جب سلطان عالیہ کا یہ سلام اور سلام میں یہ مقطع دیکھا اس وقت یہ بھید کھلا:

اب ہمارے لئے لبیک ہوئی اے سلطان کربلا ہند سے جاتے ہیں خراساں ہو کر

مجھے تلامذہ میر مونس معاف فرمائیں، انصاف شیوہ اے ست کہ بالائے طاعت است۔ سلطان عالیہ کے مقطع میں کربلا، ہند، خراساں، یہ الفاظ ایسے ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کہاں سے، کہاں کو، کہاں ہو کر جاتے ہیں۔ پس ادائے مطلب کے لحاظ سے اس کا پایہ میر مونس مرحوم کے مقطع سے بڑھا ہوا ہے۔ بہر حال، معلوم ہوتا ہے کہ میر مونس مرحوم نے سلام بعد کو فرمایا۔ اسی خیال سے لفظ "بھی" سے اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ علاوہ مداح اول، سلطان عالیہ، کے ہم بھی خراساں ہو کر روضۂ شاہ پر یعنی کربلائے معلی جائیں گے اور ایسا اشارہ میرے خیال میں مرحوم کے کمال اور کمال نیک نفسی پر دلالت کرتا ہے۔ ایک قافیہ سلطان عالیہ کے سلام میں "دنداں" ایسا عمدہ بندھ گیا ہے کہ پھر اس قافیہ "دنداں" کو میر مونس صاحب مرحوم نے نہیں باندھا، اور میرے خیال میں سلام میں اس شعر سے بہتر یہ قافیہ اور بھی کوئی شاعر مشکل سے باندھ سکے گا۔ دیکھئے وہ شعر یہ ہے:

لب و دنداں پہ سرِ شاہ کے دیکھی جو چھڑی بی بیاں رہ گئیں انگشت بہ دنداں ہو کر" (ص ۱۰۲)

شائی کا کہنا ہے کہ مونس کے مقطع میں "بھی" کا لفظ نہیں ہے۔ انہوں نے "ہم اے مونس" کہا ہے اور مراثی مونس کی نول کشوری جلد (۱۸۹۵) میں بھی "اے" چھپا ہے۔ پھر وہ سلطان کے مقطع پر مختلف اعتراض کرتے ہیں، مثلاً یہ کہ مصرع ثانی میں "ہند" سے کربلا جانے کا ذکر بے محل ہے اس لئے کہ "سلطان عالیہ ہند میں تو بیٹھی ہوئی ہیں۔" (ص ۵)

مونس کے مقطع میں کچھ خوبیاں دکھانے کے بعد شاکی ثاقب کے اس بیان کی تردید کرتے ہیں کہ مونس نے اپنے سلام میں "دنداں" کا قافیہ نظم نہیں کیا ہے۔ اور بتاتے ہیں کہ نول کشوری جلد کے سلام میں یہ قافیہ موجود ہے اور "ہمارے احباب کے پاس اس سلام کی جو نقل ہے اس میں یہ شعر یوں نظر آتا ہے:

لب شبیرؑ پہ رکھی جو چھڑی ظالم نے　　　لی بیاں رہ گئیں انگشت بہ دنداں ہو کر"

(ص ٦۔۵)

یہ شعر شاکی نے مطبوعہ سلام کے بجائے قلمی نقل کے حوالے سے درج کیا ہے۔ لیکن مونس کے مطبوعہ مراثی (جلد اول ص ۵۰) اور سلاموں کے مجموعے "دیوان فصاحت عنوان" (ص ۸۱) میں "ظالم" کی جگہ "حاکم" اور "لی بیاں رہ گئیں" کی جگہ "لوگ رونے لگے" کے ساتھ پورا شعر اس طرح ہے:

لب شبیرؑ پہ رکھی جو چھڑی حاکم نے　　　لوگ رونے لگے انگشت بدنداں ہو کر

سلطان عالیہ کے شعر پر شاکی کو کئی اعتراض ہیں، مثلاً اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ چھڑی کس نے رکھی، "لب" اور "دنداں" میں سے کوئی ایک لفظ کافی تھا، "لب و دنداں" کے لئے "سر" کی قید بے کار ہے اس لئے کہ لب و دنداں بدن کے کسی اور حصے کا نہیں، سر ہی کا جز ہیں۔ دونوں مصرعوں میں "دنداں" کی تکرار مناسب نہیں۔ "دیکھی" کے لفظ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ "اہل حرم کے دربار یزید میں آنے سے قبل سے وہ چھڑی لب و دنداں پر تھی اور ان مخدرات عصمت نے وہاں پہنچ کر یہ سماں دیکھا، یا ان...... کے دربار میں تشریف لانے پر ان کے چھیڑنے کے لئے ایسی بے ادبی کی گئی۔" (ص ۱۳) پھر بتاتے ہیں کہ واقعتاً دوسری صورت پیش آئی تھی جس کا اشارہ مونس کے یہاں "رکھی جو چھڑی ظالم نے" سے ملتا ہے۔ مونس کے شعر کی کچھ اور خوبیاں بیان کرتے ہیں جن میں "ظالم" کے لفظ کا عمدہ استعمال بھی ہے۔ ضمناً سلطان عالیہ کے ایک اور مصرعے "عید قرباں کی کرو شاہ پہ قرباں ہو کر" پر بھی اعتراض کرتے ہیں کہ "عید قرباں" کی جگہ "عید قرباں کی" خلاف فصاحت

ہے۔

نفسِ مضمون کے لحاظ سے شاکی کے ایرادات بہت سخت نہیں ہیں اور سلطان عالیہ کے صرف دو شعروں اور مقطع تک محدود ہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاکی دل میں کوئی غبار بھرے بیٹھے تھے اور اپنی تحریر کو ہنگامہ خیز بنانا چاہتے تھے۔ ثاقب کے اقتباس کے پہلے ہی جملے پر انھوں نے حاشیہ دیا کہ "ایک بات اور بھی سن لیجیے"، "یہ بھی کہہ دوں"، "اور پھر یہ بھی کہہ دوں"، یہ جملے ہمارے مخدوم کے تخن تکیہ ہیں۔" (ص ۳) ثاقب کے اس دعوے کی تردید میں کہ مونس نے اپنے سلام میں "دنداں" کا قافیہ نظم نہیں کیا، نول کشوری جلد میں اس قافیے کے شعر کی موجودگی کی اطلاع دینے سے پہلے لکھتے ہیں:

"ہم کو نول کشور کی گستاخی پر سخت غصہ ہے کہ آج سے چھبیس برس قبل اس نے غشی صاحب (ثاقب) کے اس دعوے کو بھی (بہ مد پیشگی) باطل کر دیا۔" (ص ٦)

اس سے بھی آگے بڑھ کر شاکی ذاتیات تک پہنچ گئے۔ سلطان عالیہ کو ثاقب کی "ہیروئن" ٹھہرا کر لکھتے ہیں:

"ان صاحب زادی کو سمجھ لینے کے بعد پھر ان کے اشعار کا سمجھنا زیادہ آسان ہے۔" (ص ۷) اس کے بعد سلطان عالیہ اور ان کی ماں ملکہ زمانیہ کے نسب وغیرہ کا ذکر کر کے ان کو ادنیٰ عورتیں قرار دیتے ہیں، پھر فیصلہ کرتے ہیں:

"ایک مجہول گھر کا مرد یا عورت کسی بڑے سے بڑے خانوادے میں آکر اگر رہ بھی جائے اور وہاں اپنی عمر ہی تیر کیوں نہ کر دے تب بھی خون کا اثر نہیں جاتا اور ہمیشہ بساندھ ہی آتی ہے اور یہ نہ ہو تو ہمارے نخاس کا ہر بساطی اور ثوریا گنج کا ہر خیراتی اور درگاہ کا ہر جمعراتی زباں داں اور لائقِ تقلید ہو جائے۔" (ص ۱۰)

لکھنؤ کے محلے ثوریا گنج (اصل نام وکٹوریا گنج) میں نصیر الدین حیدر کا قائم کیا ہوا خیرات خانہ ہے اور درگاہ جناب عباس میں جمعرات، خصوصاً نوچندی جمعرات، کو سائلوں کا بھی مجمع ہوتا ہے۔ اس طرح سلطان عالیہ کی تحقیر کرنے کے بعد شاکی عبرت کے لہجے میں کہتے ہیں:

"خدا کی شان، میر مونس (جن کا خاندان اور جن کی زبان اب تک فاتوا بسورۃ من مثلہ پکار رہی ہے) کا مقابلہ کس عورت سے کیا جاتا ہے! ہاں، میر ضمیر یا خود مرزا دبیر صاحبان بڑھائے جاتے تو خیر ہم طرح بھی دے جاتے۔" (ص ۱۱)

سلطان عالیہ پر اکتفا کرنے کے بجائے شاکی ان کے استاد دبیر پر بھی حملہ کرنے لگتے ہیں اور انھیں اس سلام کی خامیوں کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں:

"ہمیں سلطان عالیہ غریب کے حال پر واقعی افسوس ہے کہ منشی صاحب موصوف کی جہت سے وہ اس طرح اعتراضات کی چاند ماری بن گئیں! اس بچاری نے جو کچھ کہا اور جتنا بھی کہا، غنیمت تھا۔ لیکن ہم کو بڑی شکایت ان کے استاد سے ہے کہ حضرت اپنے تلامذہ پر وہ نظر عنایت نہیں رکھتے جو شفیق استادوں کا شیوہ ہے اور اس وجہ سے ان کے فیض تلمذ کا کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکا اور ناقص ناقص ہی رہ گیا۔ افسوس اور صد ہزار افسوس!!" (ص ۱۲)

"ایسی فاش (فاحش) غلطیوں کا الزام بھی ایک غریب عورت پر کیا دیا جائے، ہاں...... ان کے استاد علیہ الرحمہ سے ضرور شکایت ہے کہ ایک ایسے شاگرد کا یہ سلام حضرت کے پیش نظر رہا، اس پر ایسی نمایاں غلطیوں سے پاک نہ کیا گیا؟" (ص ۵۰)

سلطان عالیہ کے شعر میں "عید قرباں کی" پر گرفت کر کے کہتے ہیں:

"زبان کی یہ کم زوریاں اور ایسی بے احتیاطیاں ادنیٰ درجے کی صحبت کی خبر دیتی اور ساتھ ہی بے علمی کو بھی ظاہر کرتی ہیں...... تعجب ہے کہ حضرت کے فیض تلمذ کے بعد بھی ہماری عید قرباں یوں حلال ہو گئی!" (ص ۱۰)

اور یہ کہ "یہ سلطان عالیہ کسی حیثیت کی عورت ہوں، مگر تھیں ذہین۔ لیکن سخت افسوس ہے کہ غلط تربیت کی وجہ سے طبیعت کاواک ہو گئی!" (ص ۱۲)

آخر میں مونس کے مصرع "لب شیر......" کی خوبیوں اور مونس کی صحیح المذاق کی تعریف کے ساتھ اس جملے پر اپنی کتاب کو ختم کرتے ہیں:

"ایسے مذاق شاعری کے رخ زیبا پر خال ہیں اور اس کے جسم لطیف میں بہ منزلہ جان۔

ان لطائف سے اگر کوئی شاعر خالی ہے تو وہ شاعر نہیں، ماعر ہے جسے بزم شعرا میں ازل سے کبھی بار ہی نہیں ملی!" (ص ۱۴)

اور حاشیے میں "ماعر" کی صراحت کر دیتے ہیں، "ماعر: بھونڈا، خبطی، مجہول" (ص ۱۴)

(۶) شکوہ شاکی

(سید سرفراز حسین رضوی خبیر لکھنوی۔ نور المطابع لکھنؤ ۱۳۴۰ھ)

عبد الرسول شاکی نے اپنی کتاب کا دیباچہ ۱۰ نومبر ۱۹۲۱ء (مطابق ۹ ربیع الاول ۱۳۴۰ھ) کو یعنی ہجری سنہ کے تیسرے مہینے میں لکھا تھا، اور اسی سنہ ہجری کے اندر اوج فرزند دبیر کے ایک شاگرد کی طرف سے اس کا جواب آ گیا۔ تخمیناً گیارہ ہزار لفظ کی اس جوابی کتاب کے سرورق کی نقل حسب ذیل ہے:

"شکوہ شاکی

نام تاریخی

گزارش خبیر

۱۳۴۰ھ

سید سرفراز حسین صاحب رضوی شاگرد حضرت اوج مغفور

حسب فرمائش جناب سید معجز حسین صاحب

بہ اہتمام احقر الزمن سید نور الحسن مالک مطبع

نور المطابع لکھنؤ میں چھپا قیمت ۲/

ملنے کا پتا: سید معجز حسین، مکان سید اعجاز حسین صاحب، نخاس، لکھنؤ

والناظر بک ایجنسی لکھنؤ"

نجیر نے سلطان عالیہ کے شعروں پر شاکی کے اعتراضوں کا جواب دینے کے علاوہ مونس کے پورے سلام اور سلطان کے کچھ اور شعروں پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ مونس کے شعروں پر، ظاہر ہے، زیادہ تر اعتراض کئے ہیں۔ کہیں کہیں تعریف بھی کی ہے، اور اعتراضوں میں بھی، کچھ کچھ طنزیہ انداز کے سوا، شاکی کے مقابلے میں جارحیت بہت کم ہے۔ کچھ شعروں کے تبصراتی فقرے حسب ذیل ہیں:

"گریاں اور غلطاں قافیہ نہیں ہو سکتے، ایطا ہے۔ اگلے لوگوں نے اس کا خیال کم رکھا ہے، مگر جب میر مونس کے کلام میں بھی یہ عیب ہے تو دوسروں میں اور ان میں وجہ امتیاز کیا رہی؟" (ص ۵)

"مطلع اچھا ہے۔" (ص ۸)

"اگرچہ مضمون پامال ہے مگر کہا مزے سے۔" (ص ۶)

"کہا اور بے مثل کہا۔" (ص ۶)

"نور کی رے رخ سے ٹکرا رہی ہے، اس عیب سے کوئی بشر خالی نہیں، مگر جب خدائے سخن کے یہاں بھی یہ عیب موجود ہو تو پھر قیامت ہے۔" (ص ۷)

"تشبیہ کی کیسی مٹی خراب ہوئی ہے۔ کلام میں ندرت کا پتا نہیں۔ خشکی ہے کہ پڑھتے وقت ہونٹ چپکے جاتے ہیں۔" (ص ۷)

"بات نئی نہ تھی مگر کہی بڑے مزے سے۔" (ص ۷)

"لفظ پرستی کا بھلا ہو۔ سارے گھر ڈھے گئے" فرمانے کی ضرورت نہ تھی۔ پہلا مصرع کڑی کمان کا تیر ہے۔" (ص ۸)

"شعر تو بے مثل ہے، مگر جناب شاکی کہیں گے کہ کس جنگل نے بستیاں لوٹ لیں، کربلا کا تو ذکر نہیں، جیسا کہ وہ سلطان عالیہ کے اس مصرعے پر معترض تھے کہ کس نے چھڑی رکھی۔" (ص ۸)

"یہی بے خبری کلام خاندان میر انیس مغفور میں مایہ ناز ہے۔" (ص ۹)

"لاش کا شین شیز کے شین سے ٹکرا رہا ہے۔ یہ جائز تو ہے مگر فاتوا السورۃ من مثلہ کے مدعیوں کے واسطے نہیں۔" (ص ۱۰)

"لیجئے! بانو کا واو تشریف لے گیا۔ ہر مرثیہ گو کے یہاں اس کی مثال ملے گی مگر فاتوا السورۃ من مثلہ کے دعوے اور یہ لغزشیں ملا کر دیکھئے تو بشریت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔" (ص ۱۱)

"تنقید سلام سلطان عالیہ مرحومہ مطبوعہ جلد شازدہم دفتر ماتم" کی سرخی دے کر سلطان عالیہ کے شعروں پر جو تبصرے کیے گئے ہیں ان کا انداز یہ ہے:

"سیدھا سادھا مطلع ہے، مگر سلام (اور مرثیے) کے خصوصیات سے مالا مال۔" (ص ۲۲)

"معمولی شعر ہے...... رعایت موجود اور واقعیت بھی تاراج نہیں ہوئی۔" (ص ۲۳)

"ہزاروں مرثیوں کی قوتوں کا یہ ایک شعر ہے۔" (ص ۲۴)

"یہ شعر درد کا مجسمہ، غیرت کا مرقع ہے۔ مذاق سلیم تو اسے شاعری کی کائنات جانتا ہے۔" (ص ۲۴)

"جناب شاکی! مسلماں کا قافیہ اس زمین میں یوں باندھا جاتا ہے۔" (ص ۲۵)

"قرآں کا قافیہ اس مضبوطی سے کہنا میر صاحب (مونس) مرحوم کو نصیب نہیں ہوا۔" (ص ۲۵)

"دیکھئے، واقعے کی تصویر یوں کھینچی جاتی ہے۔" (ص ۲۵)

"ایسے شعر جنت کا مول ہوا کرتے ہیں۔ لفظ نہیں رکھے ہیں، ان مول ہیرے جڑے ہیں۔" (ص ۲۶)

"یہ شعر ویسا ہی معمولی ہے جیسا کہ میر مونس کا یہ شعر......" (ص ۲۶)

تبصرے ختم کر کے خبیر لکھتے ہیں:

"ناظرین! اب انصاف آپ کے ہاتھ میں ہے۔ دیکھئے سلطان عالیہ مرحومہ نے کتنا پیارا سلام کہا ہے۔ ہمارے شاکی سلام کی تعریف اور تنقید سے قطع نظر کر کے اس مرحومہ کے خاندان پر بے جا حملے کرنے لگے۔" (ص ۲۶)

اور اس کا سبب یہ بتاتے ہیں :

"ہمارے مہربان اس شرف کو مٹانا چاہتے ہیں کہ خاندان شاہی کے اکثر افراد مرزا صاحب مرحوم کے شاگرد تھے اور محلات شاہی میں ان کی زبان کی سند لی جاتی تھی۔ ایسی چہ میگوئیوں سے یہ شرف مٹ نہیں سکتا۔" (۲۷)

شاکی نے اپنی کتاب میں اطلاع دی ہے کہ فدا علی خنجر "آج کل (۱۹۲۱ میں) میر انیس اور خاندان انیس کے حالات قلم بند کر رہے اور ان کی زبان و شاعری پر تبصرہ لکھ رہے ہیں" اور یہ کہ شامت کی "حیات دبیر" پر برسوں سے جو گفتگو ہو رہی ہے "اس کا فیصلہ جناب خنجر کا تذکرہ بہ آسانی کر دے گا۔" (ص ۲) اور یہ بھی کہ "حسن اور خصوصاً میر خلیق کے ذکر میں جناب خنجر نے اپنی تالیف "تذکرہ انیس و خاندان انیس" میں خصوصیات زبان پر ایک مفصل بحث کی ہے۔" (ص ۱۰) خبیر خنجر کی کتاب کے اس ذکر پر یوں تبصرہ کرتے ہیں :

"بشارت دی جاتی ہے کہ یہ (شاکی کی کتاب) تو "حیات دبیر" کے صرف ایک ورق کی تنقید ہے۔ہاں، جناب خنجر کی تیز دستیاں "حیات دبیر" کا فیصلہ کر دیں گی۔" (ص ۴)

اور اس پر حاشیہ دیتے ہیں :

"تذکرہ خنجر سے ایک مداح حسینؑ کی حیات کا فیصلہ واقعی ممکن ہے، کہ خنجر ہی سے اصل ممدوحین کا بھی فیصلہ ہوا ہے۔ مگر نہ معلوم بہ آسانی ہو گا یا رنگ لائے گا۔" (ص ۴)

خنجر کی زیر تصنیف کتاب کے ذکر پر خبیر کا تبصرہ یہ ہے کہ "اس میں سوا اس کے اور کوئی بات نظر نہیں آتی کہ ایک ماہر فن تجارت آئندہ شائع ہونے والی کتاب کا خوبصورتی سے اشتہار دے رہا ہے۔" (ص ۴) خبیر یہ شبہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ "میر مونس اور حیات دبیر" کے اصل مصنف "جناب خنجر ہیں جو حضرت شاکی کے پردے میں اپنی تڑپ دکھا رہے ہیں۔" (ص ۴)

خبیر بھی اشارتاً کنایتاً ذاتیات تک پہنچ جاتے ہیں۔ مثلاً شاکی کا یہ قول نقل کر کے کہ "ایک مجہول گھر کا مر دیا عورت...... خون کا اثر نہیں جاتا" لکھتے ہیں :

"اگر یہ رائے صداقت سے دست و گریباں سمجھی جائے تو قیامت کا سامنا نظر آتا ہے۔ جناب نجم کے تذکرے..... کا عیب جو ابھی بیان نہیں ہے، ذمے جائے گا، اور اس کی وجہ ایسی ہے کہ ہماری تہذیب اس کے اظہار کی اجازت نہیں دیتی۔" (ص ۴) شاکی کے ایک اور جملے "..... نوریا گنج کا ہر خیراتی اور درگاہ کا ہر جعفراتی ..... " پر نجیب حاشیہ لگاتے ہیں:

"کوئی جناب شاکی کی طبیعت کا آدمی ہوتا تو ایک قافیہ اور بڑھا دیتا کہ "چوک کا ہر شبراتی" اور اس کے معنی بھی حاشیے پر لکھ دیتا۔" (ص ۳) ظاہر ہے یہ کسی پر ذاتی حملہ ہے۔ خاندان انیس والوں کی سکونت چوک کے علاقے میں تھی۔ یہ اشارہ ان میں سے کسی کی طرف ہو سکتا ہے۔

ان حملوں کا سبب شاکی ہی ہیں جن کی تیز زبانیوں نے نجیب کو مشتعل کر کے ان سے یہاں تک لکھوالیا:

"جناب شاکی کا یہ ارشاد کہ "میر مونس کے مقابلے میں اگر میر ضمیر یا خود مرزا دبیر بڑھائے جاتے..... " تو اس کا جواب تو یہ ہے کہ میر مونس تو میر مونس، اہل ذوق کو یہ بھی گوارا نہیں کہ دبیر کا انیس سے مقابلہ کیا جائے اور اکثر نکتہ سنج بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں کہ زمانے نے دبیر کو اتنا گرایا، اتنا گرایا کہ اب لوگ دبیر اور انیس کا نام ساتھ لینے لگے۔" (ص ۵)

(۷) موازنہ انیس و دبیر

(شبلی نعمانی۔ طبع اول، مفید عام پریس، آگرہ ۱۹۰۷ء)

موازنے کا شمار اردو تنقید کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ انیس شناسی کے سلسلے میں بھی اس کی اہمیت مسلم ہے، لیکن یہاں اس کا ذکر صرف معرکہ انیس و دبیر کے سیاق و سباق میں کیا جائے گا جس کے لیے اس کتاب کی مجموعی ہیئت کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔

قریب ایک لاکھ لفظ (۲۸۵ صفحے) کی اس کتاب کے مشتملات اس طرح ہیں:

عربی فارسی مرثیے اور انیس سے قبل تک اردو مرثیے کے مختصر تعارف کے بعد موازنے کے سلسلے میں:

"دونوں حریفوں کے مرثیوں کو سامنے رکھ کر دیکھو تو صاف نظر آتا ہے کہ ایک نے دوسرے کے کلام کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ لیکن زمانے کے تقدیم و تاخیر کے نہ معلوم ہونے سے یہ نہیں متعین ہوتا کہ ایجاد کا فخر کس کو ہے اور کس نے کس سے کیا اثر لیا ہے۔" (ص ۱۸)

"میر انیس جا بجا فخریہ شعروں میں اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ ان کے حریف ان کے کلام سے فائدہ اٹھاتے ہیں...... ان چوٹوں کو سن کر مرزا دبیر صاحب برابر کا جواب نہیں دیتے، یعنی یہ نہیں کہتے کہ میں نہیں میرا حریف سرقہ کرتا ہے۔ اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے (کہ) میر انیس میرزا صاحب سے مقابلے کا قصد نہیں کرتے تھے ورنہ میرزا صاحب ضرور اس کا اشارہ کرتے۔ اس کے ساتھ جب مرثیوں سے صاف ثابت ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مقابلے پر لکھے گئے ہیں تو خواہ مخواہ ماننا پڑتا ہے کہ مقابلہ اور ہم طرحی و مسابقت کی کوشش میرزا صاحب ہی کی طرف سے ہوتی تھی...... جن مرثیوں یا اشعار یا مضامین میں توارد ہے ان کی تفصیل آگے آئے گی اور وہاں اس تمہید کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔" (ص ۱۹۔ ۱۸)

اس دلیل سے شبلی نے انیس کو موجد اور دبیر کو مقلد قرار دیا ہے، لیکن دبیر کے تمام کلام کو نظر میں رکھے بغیر اس قسم کی دلیل محکم نہیں ہوتی اور اگر دبیر کے یہاں بھی اس قسم کے اشارے مل جائیں کہ "ان کے حریف ان کے کلام سے فائدہ اٹھاتے ہیں" تو یہ دلیل ختم ہو جائے گی۔

"میر انیس کی شاعری کی خصوصیات" کے زیر عنوان: "اب ہم تفصیل کے ساتھ میر صاحب کی شاعری کی خصوصیات بیان کرتے ہیں۔"

شبلی کا اصل موضوع یہی ہے اور اس نے موازنے کے دو سو سے زیادہ صفحے لئے ہیں۔
"اعتراضات" کا عنوان دے کر لکھتے ہیں:

"میر انیس کے کمال کا اگرچہ جس قدر مجھ کو اعتراف ہے، شاید ہی کسی اور کو ہوگا، تاہم میرا یہ دعویٰ نہیں کہ ان کا کلام فروگزاشتوں اور غلطیوں سے پاک ہے۔" (ص ۲۲۵)

اس کے بعد نساخ کی "انتخاب نقص" کے حوالے سے کچھ اعتراضوں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:

"ان اعتراضات کے علاوہ نساخ نے اور بھی بہت سے اعتراض کئے ہیں لیکن چونکہ وہ صحیح نہ تھے، قلم انداز کئے گئے۔ نساخ نے بہت سے صحیح اعتراضات چھوڑ بھی دیئے۔ ان کی تفصیل ذیل میں ہے۔"

اور انیس کے یہاں بعض لفظی غلطیوں اور معنوی خامیوں کی نشان دہی کرنے کے بعد دو باتوں پر اعتراض کیا ہے۔ ایک یہ کہ "اکثر جگہ پر مصرعوں میں باہم ربط نہیں ہوتا۔" (ص ۲۳۰) اور دوسری یہ کہ "اکثر جگہ لفظی رعایت کی پابندی کی وجہ سے کلام اوچھا اور بے اثر ہو جاتا ہے۔" (ص ۲۳۱) پھر لکھتے ہیں:

"ان تمام اعتراضات کا صرف یہ جواب ہے کہ لفظی رعایت کی پابندی کے سوا جو لکھنؤ کا خمیر بن گیا تھا، باقی عیوب لازمہ انسانی ہیں اور کسی بشر کا کلام ان سے پاک نہیں ہو سکتا۔ (ص ۲۳۲-۳۳)

"سرقات" کے ذیل میں کچھ مثالیں پیش کی ہیں جن میں انیس نے دوسروں کے مضمون کو ادا کیا ہے۔

"میر انیس اور مرزا دبیر کا موازنہ" ' یعنی نام کے لحاظ سے اصل کتاب ' صرف انیس صفحوں میں ہے اور اس موازنے میں زیادہ تر کلام دبیر کے معائب سے سروکار رکھا گیا ہے اگرچہ یہ بھی اعتراف کیا گیا ہے کہ دبیر کا کچھ کلام شاعری کے اعلیٰ معیار پر پورا اترتا ہے لیکن اس کا سبب ایک تو یہ بتایا گیا ہے کہ دبیر نے لاکھوں شعر کہے (جن میں کچھ کو تو عمدہ ہونا ہی

تھا)، اور دوسرا یہ کہ "آخر اخیر میں وہ میر انیس کی تقلید بھی کرنے لگے تھے۔" (ص ۲۳۷)

"میر انیس اور مرزا دبیر کے متحد المضمون مرثیے" کتاب کا آخری حصہ ہے جو اکیس صفحوں میں گیا ہے۔ زیادہ تر مثالیں اس بات کو ثابت کرنے کے لئے ہیں کہ انیس مضمون کو دبیر سے بہتر ادا کرتے ہیں، البتہ دو جگہ دبیر کے حق میں فیصلہ کیا ہے۔

کلام انیس کے تنقیدی جائزے کی حیثیت سے موازنہ قابل قدر کتاب ہے، لیکن دو شاعروں کے تقابلی مطالعے کے لحاظ سے اس کے طریق کار کو درست نہیں سمجھا گیا ہے۔ انیس کے مقابلے میں دبیر کے کلام سے اتنی کم مثالیں دی گئی ہیں (وہ بھی دبیر کو کم تر ثابت کرنے کی غرض سے) کہ ان سے موازنے کا حق ادا نہیں ہوتا۔ یہ بھی شبہ ہوتا ہے کہ شبلی نے دبیر کے کلام کا تفصیلی اور ہمدردانہ مطالعہ نہیں کیا ہے۔ یہ رویہ دبیریوں کو آزردہ کرنے کے لئے بہت تھا، اس پر مستزاد یہ کہ شبلی نے جا بجا دبیر کے معاملے میں توہین آمیز اور اشتعال انگیز لب ولہجہ اختیار کیا اور اس میں نساخ سے بھی آگے بڑھ گئے جن کا مقصد ہی دبیر (اور انیس) پر اعتراضات کرنا تھا۔ "انتخاب نقص" میں نساخ کے جارحانہ فقرے کچھ اس طرح کے ہیں:

"اس رباعی کا تیسرا مصرع ناموزوں ہے، یا مرزا صاحب نے بہ زور طبع موزوں اوزان رباعی میں کوئی نیا وزن نکال کے رکھ دیا ہے۔" (ص ۸)

"حج کعبہ بغیر تشدید حرف جیم جس قدر فصیح ہے، ظاہر ہے۔" (ص ۹)

"اگر مرزا صاحب نے علم ہیئت ونجوم کے کمال سے آفتاب کا رنگ سپید ثابت کیا ہو تو اس کی دلیل چاہئے۔" (ص ۱۳)

"مرزا صاحب نے...... قیاس کر کے...... لفظ لکھا ہے۔ واہ رے قیاس۔" (ص ۱۸)

"ہراساں...... کا نون کہاں گیا؟ خلاصہ یہ کہ قافیہ تنگ ہو گیا تھا اس لئے نون کو حذف کر کے ہراسا بنا دیا۔" (ص ۱۷)

"غرض کا لفظ رزق کے ساتھ کیا خوب واقع ہوا ہے کہ قابل دید ہے۔" (ص ۱۸)

"تخت پر ساغر رکھنا نیا دستور ہے۔ یہ گویا خاص ایجاد مرزا صاحب ہے۔" (ص ۱۹)

"لفظ ہوا...... ایسے محل پر نہیں بولتے، اور اگر کہا جائے کہ ضرورت شعری سے لکھا گیا ہے تو شعر کہنا کیا ضروری ہے؟" (ص ۲۰)

نساخ کے ان سطحی طنزیہ فقروں کے مقابلے میں شبلی کا طنزیہ انداز یہ ہے:

"شہرہ ہے یہ تائید شہ جن و ملک سے   مضموں مرا گھر پوچھتے آتے ہیں فلک سے (دبیر)

شہرہ بھی انتہا کا ہے اور مضمون کو گھر پوچھنے کی بھی ضرورت ہے! شاید یہ مراد ہو کہ صرف نام مشہور ہو چکا ہے لیکن چونکہ مضامین کو کبھی مرزا صاحب سے روشناسی نہیں ہوئی اور آستانہ مبارک تک پہنچنے کی نوبت نہیں آئی اس لئے گھر کا پتا پوچھنا پڑا۔" (ص ۲۴۴)

شبلی کے دوسرے اعتراضی فقرے اس طرح کے ہیں:

"لوگ مبتذل اور سوقی الفاظ کو بھی فصیح سمجھ لیتے ہیں حالانکہ ان دونوں میں سفید و سیاہ کا فرق ہے۔ میرزا دبیر صاحب جہاں واقعہ نگاری اور معاملہ بندی میں میر انیس کی تقلید کرتے ہیں، اکثر ان کے کلام میں مبتذل الفاظ آجاتے ہیں۔" (ص ۲۳۔۲۲)

(تلوار کا ذکر) "مرزا صاحب تو اس عالم میں لامکان تک پہنچ جاتے ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سب کچھ کہتے ہیں اور غور سے دیکھیے تو (تلوار کے متعلق) کچھ نہیں کہتے، چنانچہ فرماتے ہیں۔ (مثالیں) خود انصاف کرو، یہ تلوار کی تعریف ہے یا ہوائی طلسم ہے۔" (ص ۲۱۴۔۱۵)

"......وہی واقعات بیان کرنے چاہئیں جن سے طبیعت پر واقعی اثر ہو۔ صرف موہوم خیال بندی اور لفاظی نہ ہو جیسا میرزا دبیر صاحب کا انداز ہے۔" (ص ۲۰)

"کس قدر بھدے الفاظ و بھدی ترکیبیں ہیں۔" (ص ۲۴۳)

"ہاتھ میں پہننے کی انگوٹھی پر سورج کا نگینہ جڑنا کس قدر لغویات ہے۔" (ص ۲۴۴)

"(دبیر نادر استعارے اور تشبیہیں لاتے ہیں) لیکن اس زور میں وہ اکثر اس قدر بلند اڑتے ہیں کہ بالکل غائب ہو جاتے ہیں۔" (ص ۲۵۱)

"اظہار کے لئے مرزا صاحب نے جو طریقہ استعمال کیا ہے وہ کس قدر سفیہانہ اور عامیانہ ہے...... نہایت پست اور مبتذل خیال ہے۔" (ص ۲۶۳)

"میر صاحب نے اس مضمون کو اس فصاحت وبلاغت سے ادا کیا ہے...... کہ اس کے سامنے مرزا صاحب کے اشعار کا پیش کرنا بھی میر صاحب کی ناقدر دانی ہے۔" (ص ۲۶۷)

"کس قدر بیہودہ تشبیہ ہے۔" (ص ۲۸۳)

"مرزا صاحب کا...... شعر...... بالکل بھدا اور بد ترکیب ہے۔" (ص ۲۸۴)

"انصاف سے دیکھو، مرزا صاحب نے میر صاحب ہی کے لفظوں کو الٹ پلٹ کیا ہے، مگر اس طرح کہ محض لفظی گورکھ دھندا رہ گیا ہے۔" (ص ۲۸۴)

لیکن شبلی سخت لفظوں میں کئے ہوئے ان جزئی اعتراضوں سے بھی آگے بڑھ گئے۔ "میر انیس اور مرزا دبیر کا موازنہ" والے باب میں انھوں نے لکھا ہے:

"شاعری کس چیز کا نام ہے؟ کسی چیز کا، کسی واقعے کا، کسی حالت کا، کسی کیفیت کا اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے،...... وہی کیفیت دلوں پر چھا جائے، اسی کا نام شاعری ہے۔ اس کے ساتھ الفاظ میں فصاحت، سلاست، روانی، بندش میں چستی اور چستی کے ساتھ بے تکلفی، دل آویزی اور برجستگی، لطیف اور نازک تشبیہات اور استعارات، اصول بلاغت کے مراعات، ان تمام اوصاف میں سے کون سی چیز مرزا دبیر میں پائی جاتی ہے؟ فصاحت ان کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی ہے، بندش میں تعقید اور انغلاق، تشبیہات اور استعارات اکثر دور از کار، بلاغت نام کو نہیں، کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں۔ خیال آفرینی اور مضمون بندی البتہ ہے لیکن اکثر جگہ اس کو سنبھال نہیں سکتے۔" (ص ۲۳۶-۳۷)

اور اس باب کی ابتدا ہی شبلی نے اس طرح کی تھی:

"اردو علم ادب کی جو تاریخ لکھی جائے گی، اس کا سب سے عجیب تر واقعہ یہ ہوگا کہ مرزا دبیر کو ملک نے میر انیس کا مقابل بنایا اور اس کا فیصلہ نہ ہو سکا کہ ان دونوں حریفوں میں ترجیح کا

تاج کس کے سر پر رکھا جائے گا۔" (ص ۲۳۶)

دبیریوں پر شبلی کے موازنے کا سخت رد عمل ہونا لازمی تھا۔ کتاب میں انیس کی جنبہ داری اور ان کے مقابلے میں دبیر کو گھٹانے کا رجحان بہت نمایاں تھا اور اس لحاظ سے اسے معرکہ انیس و دبیر میں انیسیوں کی طرف کی کتاب سمجھا جاسکتا تھا، لیکن غیر معمولی بات یہ تھی کہ اس میں انیس کے کلام پر اعتراضات کا بھی باب تھا اور اس سے بھی زیادہ غیر معمولی بات یہ تھی کہ موازنے کے جواب میں دبیریوں نے انیس پر ان اعتراضوں کا بھی جواب دیا۔ شبلی نے غالباً پکے انیسیے ہونے اور انیس کی اندھا دھند حمایت کرنے کے الزام سے بچنے کے لئے کلام انیس کی کچھ خامیاں بھی گنوادی تھیں۔ لیکن یہ رویہ معرکے کے عام مزاج اور روش کے خلاف تھا، اس لئے اس کو مختلف معنی پہنائے گئے اور شبلی کی نیت پر بھی شبہ کیا گیا۔ موازنے کی جوابی کتابوں میں کہیں کہیں اس خیال کا اظہار کیا گیا کہ شبلی کو انیس و دبیر دونوں سے عناد ہے، اسی لئے انہوں نے انیس کی آڑ لے کر دبیر کی بدگوئی کی، پھر انیس پر اعتراضات کر کے ان کو بھی دبیر کی صف میں لے آئے۔ کہیں یہ الزام لگایا گیا کہ وہ دونوں استادوں کے کلام میں خامیاں گنوا کر خود اپنی لیاقت کی نمائش کرنا چاہتے ہیں اور بعض جوابوں میں الزاموں کو بد مذاقی کی حد تک پہنچا دیا گیا۔ دبیر کے سلسلے میں شبلی کے انداز بیان کو بھی ناپسند کیا گیا اور ان کی ذات پر بھی حملے کیے گئے۔ موازنے کے جو جواب ہمارے پیش نظر ہیں وہ رد عمل کی مختلف صورتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

(۸) تردید موازنہ

(شیخ محمد جان عروج فیض آبادی۔ نوشتہ شیخ حسن رضا، مطبع تصویر عالم، لکھنؤ)

کتاب کے سرورق کی نقل حسب ذیل ہے:

"جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل کان زھوقا

دشت وحشت میں چمن کا لطف مل سکتا نہیں

غنچہ وگل کی روش سے خار کھل سکتا نہیں

تردید موازنہ

جناب مولوی شبلی صاحب نعمانی نے ترکیب تحریر موازنہ سے جو جناب میر انیس صاحب ومرزا دبیر صاحب کے کمال سخن وری کو عوام الناس میں مٹا کے ترجیح کی مسند پر خود جلوہ فرمانا چاہا تھا لیکن خدا کی بوھائی ہوئی عزت وشہرت کو انسان کی کیا مجال ہے کہ گھٹا سکے، اس کو مصنف جناب شیخ حسن رضا صاحب نے شمس الشموس عروج سخن وری، قمر الاقمار بروج نکتہ پروری، معجز بیان جناب شیخ محمد جان عروج کی ہوائے تقریر با توقیر سے ان کے ایرادات بے جا کو مثل گرد وغبار کے اڑا دیا اور معترض کی ناواقفی وناسمجھی اور زبان اردو سے بد مذاق کا ثبوت دے کر صاحبان انصاف کے روبرو حق وباطل کو ظاہر کر دیا:

خزاں چمن میں جو آئی تھی خاک اڑانے کو

برس کے ابر بہاری نے صاف دھو ڈالا

بہ اہتمام داروغہ سید محمد پروپرائٹر در مطبع تصویر عالم لکھنؤ مطبوع گردید۔ محمد علی پریس مین ساکن ڈالی گنج نے چھاپا (شائقین کو یہ کتاب دفتر مطبع مشرق نور مظفر پور سے بے قیمت مل سکتی ہے)۔"

یہ کتاب تخمیناً ساڑھے دس ہزار الفاظ پر مشتمل ہے۔

تلاش کی "دربار حسین" میں عروج کا مندرجہ ذیل حال ملتا ہے:

"عروج: جناب محمد جان صاحب عروج فیض آبادی، حال مقیم مظفر پور، محلہ کمرہ، آپ نے مولوی شبلی صاحب کے موازنے کے جواب میں ایک مختصر رسالہ "تردید موازنہ" بھی اپنے مطبع مشرق نور، مظفر پور سے شائع فرمایا تھا جس کو تخمیناً بارہ سال ہوئے۔ آپ خود لکھتے ہیں کہ سنہ اٹھارہ سو چونسٹھ عیسوی میں میر صفدر علی خان صفدر (مشہور شاگرد حضرت دبیر)

نے مجھے ہمراہ لے جا کر میرزا دبیر صاحب کی شاگردی کا اعزاز بخشوایا تھا۔ مگر اب میری بصارت و سماعت و دماغ میں ضعف آگیا (ہے)۔ سات اولادیں ہوئیں۔ ایک لڑکا اٹھارہ سالہ باقی، اور علوم دینی و دنیوی میں کامل تھا۔ وہ بھی مجھے دیوانہ بنا کر ملک عدم کو راہی ہوا۔" (ص ۱۹۶)

لیکن "تردید موازنہ" میں عروج کے شاگرد دبیر ہونے کا ذکر نہیں اور موازنے کا جواب انیس و دبیر دونوں کے ایک مداح کی حیثیت سے دیا گیا ہے۔

مولف شیخ حسن رضا بتاتے ہیں کہ آج کل "موازنہ انیس و دبیر" پر جو ہنگامہ برپا ہے، میں اس کی طرف توجہ نہیں کرتا تھا لیکن ایک دن ایک بزرگ نے یہ کتاب مجھ کو دکھا کر کچھ ایسی باتیں کہیں کہ میرا "نفس تنگی کرنے لگا۔" خود میری اتنی استعداد نہ تھی کہ اس کے وزن و صداقت کی جانچ اور اس کے نفس مطلب کا اندازہ کر سکتا۔ لہٰذا اس کو اپنے ایک "خوش خیال عالی فہم دوست" شیخ محمد جان عروج فیض آبادی کے پاس لے گیا۔ یہ بزرگ کچھ عرصے سے مظفر پور میں مقیم ہیں۔ شاعر و ذاکر اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انیس و دبیر کے ہم پلہ مرثیہ گو ہیں اور دونوں کو "خدائے سخن وری" مانتے ہیں، کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دیتے۔ "ان دونوں ممدوحین مرحومین کی زیارت و ہم نشینی کا شرف بھی حاصل کر چکے ہیں۔"

موازنے کے متعلق عروج کے ساتھ اپنے سوال جواب نقل کرنے سے پہلے حسن رضا اس قضیے میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں کہ انیس و دبیر نے بہ تقاضائے بشریت غلطیاں ضرور کی ہوں گی "لیکن ان سے وہ خطائیں اور فروگزاشتیں ایسی ہوئی ہوں گی جو جناب مولوی شبلی نعمانی صاحب کے طائر وہم و قیاس کے حد پرواز سے بھی باہر ہوں گی۔" شبلی نے ان دونوں کے کلام میں جو نقائص دکھائے ہیں وہ اتنے بدیہی ہیں کہ ہر اردو داں صاحب مذاق سمجھ سکتا ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ ان باکمالوں سے ایسی غلطیاں سرزد نہیں ہو سکتیں بلکہ یہ نقل در نقل اور دوسروں کی تحریفوں کی وجہ سے ان کے کلام میں راہ پا گئی ہیں۔

اس کے بعد شبلی اور موازنے کے متعلق سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جوابوں کا خلاصہ یہ ہے:

شبلی عوام الناس میں نئی روشنی کے مورخ و مصنف شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کی سوانحی کتابوں کا اصل مقصد خود اپنی لیاقت کی نمائش ہے۔ موازنہ بھی فن شاعری پر اپنا عبور ظاہر کرنے کے لئے لکھا گیا ہے ورنہ انیس و دبیر کا رنگ سخن جدا جدا ہے اور ان دونوں کا موازنہ ہو ہی نہیں سکتا۔ شبلی لکھنؤ کی زبان سے "یک لخت ناآشنا" ہیں، اسی لئے وہ اردو کو "کم مایہ" زبان بتاتے ہیں "حالانکہ یہ بات مانی ہوئی ہے کہ اس اردو زبان سے بڑھ کر دنیا میں کوئی زبان وسیع اور پرمایہ خلق ہی نہیں ہوئی۔"

لکھنؤ کی زبان بہ ظاہر ایک ہے لیکن "لب ولہجہ اور الفاظ مستعملہ" کے لحاظ سے مختلف طبقوں، علما، حکما عوام وغیرہ کی زبان میں بڑا فرق ہے۔ "شعرا کے کلام حسب حیثیت علم نظم ہوتے ہیں...... مرزا دبیر صاحب کو علم فارسی و عربی بہت بڑھا ہوا تھا اسی وجہ سے مرزا صاحب اپنے کلام میں الفاظ و تراکیب فارسی عربی کی زیادہ تر استعمال فرماتے تھے اور خود اس رنگ کو بہت پسند کرتے تھے۔"

میر انیس کے طرف دار جو شبلی کی "تحریر فتنہ انگیز پر غوغا کئے ہیں" ان سے عرض ہے کہ "غور سے موازنہ کے آخر میں مطالعہ کریں کہ (شبلی نے) فقط مرزا دبیر ہی کو نہیں ستایا ہے، آپ لوگوں کی تالیف قلوب کر کے میر انیس صاحب کے کلام میں بھی اپنے من مانے عیوب دکھلا کے اپنے تئیں دونوں پر فوقیت دے رہے ہیں۔"

سلام کے اس شعر کو شبلی میر انیس کا بتاتے ہیں:

بھلا تردد بے جا سے ان میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیں دار جن زمینوں کو

یہ میر مونس کا شعر ہے۔ "جس صحبت میں یہ پڑھا گیا تھا، میں خود موجود تھا، آغا میر کی ڈیوڑھی پر لکھنؤ میں جناب نواب میر محمد حسین صاحب کے یہاں جو ماہوار ۲۶ کو خاص میر

مونس صاحب کے پڑھنے کی (مجلس) مقرر تھی وہاں یہ سلام میر مونس صاحب نے خود پڑھا تھا جس پر نواب ممتاز الدولہ بہادر کو ملال ہوا، کیونکہ وہ مرزا دبیر صاحب کے شاگرد تھے، اور اٹھ کے چلے گئے۔"

انیس و دبیر پر شبلی کے بیشتر اعتراض ان کی زبان نافہمی پر مبنی ہیں، یا مرثیوں کے غلط متون پر، یا متن کی غلط قرات پر۔

عروج نے شبلی کے اعتراضوں کے جو جواب دیئے ہیں وہ بہت اطمینان بخش نہیں ہیں البتہ بعض جواب صحیح ہیں، مثلاً دبیر کی اس بیت پر:

شہرہ ہے یہ تائید شہ جن وملک سے
مضموں مرا گھر پوچھتے آتے ہیں فلک سے

شبلی کا اعتراض ہے کہ یہ دونوں مصرعے متناقض ہیں، "شہرہ بھی انتہا کا ہے اور مضمون کو گھر پوچھنے کی بھی ضرورت ہے۔" عروج کا جواب یہ ہے:

"(یہ) اردو زبان کا محاورہ اور ضرب المثل ہے۔ تمام ہند کی اردو زبان میں ہر جگہ روز مرہ یہی جاری ہے کہ فلاں شخص اپنے کمال میں ایسا شہرہ آفاق ہے کہ دور دور سے شائقین گھر پوچھتے چلے آتے ہیں۔ کیوں حضرت، شہرہ کمال یا نام کا ہوتا ہے یا شہرہ کمال اپنی پشت پر صاحب کمال و نام ور کا گھر بھی لادے دکھلاتا پھرتا ہے؟"

"تردید موازنہ" میں شبلی پر ذاتی حملے بھی ہیں۔ شہرت کی ہوس کے علاوہ کہیں کہیں انہیں مذہبی تعصب میں بھی مبتلا ظاہر کیا گیا ہے اور کہیں خود بھی تعصب کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ جا بہ جا فقرے بھی چست کیے گئے ہیں جن کی وجہ سے تحریر کا انداز غیر متین سا ہو گیا ہے لیکن کتاب کا مجموعی لہجہ کم سے کم "ردالموازنہ" کے مقابلے میں متین کہا جا سکتا ہے۔

(۹) ردالموازنہ

(میر افضل علی ضو لکھنوی، مطبع تصویر عالم، لکھنؤ ۸۔۷۔۱۹۰ء)

کتاب کے سرورق کی نقل حسب ذیل ہے:

"جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا

ردالموازنہ

مولفہ شمس الشموس اوج سخن وری، قمر الاقمار بروج نکتہ پروری، فضائل مآب جناب میر افضل علی صاحب متخلص بہ ضو بہ تصحیح و فرمائش ادیب باکمال، خطیب بے مثال، حاوی علوم معقول و منقول، جناب سردار مرزا صاحب خلف حجتہ الاسلام حضرت مفتی نواب مرزا صاحب قبلہ مرحوم طاب ثراہ ساکن کاظمین شریفین لکھنؤ۔

اعلان: جناب مولف نے حق تصنیف جناب مرزا صاحب موصوف الذکر کو ہبہ کر دیا ہے۔ پس کوئی صاحب تاجر وغیر تاجر بغیر ان کی اجازت کے کسی نوع سے اس کتاب کو طبع نہ فرمائیں۔

در مطبع تصویر عالم لکھنؤ صورت طبع گرفتہ بہ جلوہ شہود آمد (بار اول ۶۰۰ جلد) بہ نشان مذکور جناب سردار مرزا صاحب سے کتاب ملے گی (قیمت بلا محصول ۶/، نذر احباب مفت)"

ستر صفحوں کی یہ کتاب تخمیناً پندرہ ہزار الفاظ پر مشتمل ہے۔ آخر کے قطعات تاریخ اس کا سال طباعت ۲۶۔۱۳۲۵ھ (۸۔۷۔۱۹۰) بتاتے ہیں۔

"ردالموازنہ" کے مصنف افضل علی ضو منیر شکوہ آبادی شاگرد دبیر اور مرزا اوج فرزند دبیر کے شاگرد تھے۔ کتاب کی تمہید میں دنیا کی بوالعجبیوں کا ذکر کرنے کے بعد شبلی اور موازنے کا خاص پھبتی بازوں والے انداز میں تذکرہ کرتے ہیں:

"دریں ولا اک کتاب مسمّی بہ "موازنہ انیس و دبیر" طبع ایجادی مولوی صاحب، مشفقت مصاحب، شبلی و نعمانی، میرے ملاحظے میں آئی، سخت حیرت ہوئی۔ میں پہلے شبلی صاحب کا

نام ہی نہیں سمجھا۔ یہ پہیلی ہو جھنا مشکل ہوئی۔ آیا دیکھنے میں ہے یا کھانے میں، چرندوں میں ہے یا پرندوں میں ہے، کہاں کا دساور ہے...... من بعد نام کتاب یعنی "موازنہ انیس و دبیر" کے معنی کی طرف غور کیا۔ یہ تو سمجھ میں نہ آنا تھا نہ آیا اس لئے کہ موازنہ ان دونوں صاحبوں کا ممکن نہیں۔ مرحومین بہشت میں ہیں، ان کا یہاں لانا اور پھر بہ کا کرا شیشن ریل پر لے جانا اور وہاں مال ترازو پر تلوانا محالات سے ہے، اور بغیر اس کے موازنہ ہو نہیں سکتا...... بااین ہمہ شبلی صاحب کے نامی گرامی ہونے میں کوئی حرف نہیں آسکتا۔ وہ بڑے حضرت ہیں، ذات شریف بلبہ شیخ اشرف۔ اگر ہندو ہوتے تو رو تار، نہیں تو پہ، لو تار سمجھتے"

شروع میں مصنف نے شبلی کی زبان پر اعتراض کئے ہیں، مثلاً

شبلی: "انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے سننے یا کسی حالت یا واقعے کے پیش آنے سے ......"

اعتراض: "یہ عبارت بالکل خلاف محاورہ اردو ہے۔ یوں لکھنا چاہئے تھا: "کسی چیز کے دیکھنے سے، سننے سے یا کسی حالت کے، یا واقعے کے پیش آنے سے،" ہائے اردو، جب تک یہ مادری زبان نہ ہو ایسی ہی خرابیاں واقع ہوتی ہیں۔"

شبلی: "...... جو کچھ کہا جائے اس انداز سے کہا جائے کہ جو اثر شاعر کے دل میں ہے وہی سننے والوں پر بھی چھا جائے۔"

اعتراض: "...... یہ دوسری ہوئی۔ اثر چھا جانا ہرگز محاورہ نہیں۔ نہ اثر کے ساتھ چھا جانا اب کوئی بولتا ہے نہ آئندہ کوئی بولے گا۔ آپ کا ذکر نہیں۔ اہل زبان کا بولنا مراد ہے۔ جون پور واعظم گڑھ اور جگہ ہے اور لکھنؤ اور مقام ہے:

سیکھ لو اے بلبلو یہ داستاں کچھ اور ہے
لکھنؤ کے رہنے والوں کی زباں کچھ اور ہے

آگے چل کر بھی جابہ جا شبلی کی زبان کو غلط اور خلاف محاورہ کہا گیا ہے۔

انیس و دبیر کے کلام پر شبلی کے اعتراضوں کے جوابوں سے کچھ مثالیں دیکھئے:

مصرع مرزا دبیر: گرمی میں مثل نار تو نرمی میں صاف نور

اعتراض موازنہ: نور میں نرمی کیسی؟

جواب: "روشنی کا جسم اب اہل طبعیات کو محسوس ہوا ہے لیکن اہل ایمان باب مدینۃ العلم کی بدولت سینکڑوں برس پیشتر سے جانتے ہیں۔"

شبلی کے اس قول کی تردید کی ہے کہ دبیر نے انیس پر سرقے کا الزام نہیں لگایا۔ دبیر کے کلام سے مثالیں پیش کی ہیں۔

کلام دبیر پر شبلی کے اعتراضوں کو پانچ طرح کا بتایا ہے۔

"۱۔ ایراد معنی بے جا"، ۲۔ "ابتدائے عمر کا کلام"، ۳۔ "اتہام بر بنائے مشہور عوام"، ۴۔ "سلقات"، ۵۔ "وہ کلام جو شبلی صاحب سے پڑھا نہیں گیا۔"

ان اقسام کے تحت شبلی کے مختلف اعتراضوں کا جواب دیا گیا ہے۔ مثلاً شبلی نے دبیر کے یہاں "متدعی شق القمر"، "مجمع جمیع خصائل"، "خاص الخلاصہ"، "المنتہیٰ" وغیرہ پر اعتراض کیا تھا کہ اردو زبان کی سلاست وروانی ان لفظوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ جواب میں ضو کا سوال ہے۔ "وہ الفاظ مستعملہ عربی وفارسی کون کون سے ہیں جن کا تحمل باوجود استعمال اردو نظم کی سلاست نہیں کر سکتی؟" ان کا کہنا ہے کہ تحریر میں ضرورتاً "الفاظ قلیل الحروف وکثیر المعنی لائے جاتے ہیں کیونکہ اگر ان کے معنی لائے جائیں تو اک بہت بڑی عبارت ہو جائے۔"

شبلی نے مرزا دبیر کی زبان کے علاوہ "بلاغت" کے زیر عنوان ان کے بیان واقعہ پر اعتراض کیا ہے:

"وہ اگر کسی واقعے کا خاکہ تیار کرتے ہیں تو اس قسم کی باتیں بیان کرتے ہیں جو خود شہادت دیتی ہیں کہ (یہ) واقعہ وجود میں نہیں آسکتا تھا...... کسی مضمون کو وہ مقتضائے حال کے موافق نہیں لکھ سکتے۔"

اور مثال کے طور پر خیمہ حسینی میں جناب قاسم کی لاش آنے اور ان کی دلہن جناب فاطمہ

کبریٰ کے بین کرنے کے سلسلے میں یہ بند نقل کرتے ہیں :

یہ بات سن کے بنڑی نے گھونگھٹ الٹ دیا — عباس کو حسینؑ کو اکبر کو دی صدا
صدقے میں تم پہ یاں سے سرک جاؤ تم ذرا — تم سب کے آگے روتے ہوئے آئے گی حیا
ماتم کا ہے ہجوم دل پاش پاش پر
جی بھر کے رو لے یہ بنی قاسم کی لاش پر

شبلی کا اعتراض ہے :

"حضرت کبریٰ کا اپنے باپ چچا بھائی سے کہنا کہ تم لوگ یہاں سے سرک جاؤ، میں اپنے شوہر پر نوحہ کرنا چاہتی ہوں، کس قدر بے شرمی ہے۔ طرہ یہ کہ یہ بھی کہتی ہیں کہ تم سب کے آگے روتے ہوئے شرم آئے گی، لیکن یہ کہتے ہوئے شرم نہ آئی۔"

ضو کا جواب ہے کہ اس بند کے قبل جو بند ہے وہ نہیں لکھا گیا :

ناگاہ کی یہ فاطمہ کبریٰ نے گفتگو — لوگو کوئی ذرا مرے والی سے پوچھ لو
گھونگھٹ میں الٹوں بال میں کھولوں جو تم کہو — ماں بولی اب نہ شرم کرو بال کھول دو
سر ننگے تم کو جانا ہے بلوائے عام میں
چھینے گا شمر اوڑھنی آکر خیام میں

اور جس گفتگو پر شبلی نے اعتراض کیا ہے وہ جناب کبریٰ کی زبان سے نہیں بلکہ ان کی والدہ کی زبان سے ہے۔ وہ مردوں سے ہٹ جانے کو کہتی ہیں تاکہ "جی بھر کے رو لے یہ بنی قاسم کی لاش پر۔"

شبلی کا ایک اور اعتراض ہے :

"ایک مرثیے میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر حضرت شہربانو کا جو نوحہ لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں :

تم جاتو جہاں سے شہ عالی کو لے آؤ
اکبر سے میں گزری مرے والی کو لے آؤ

......یہ امر کس قدر خلاف مقتضائے حال کے ہے کہ کوئی شریف عورت یہ کہے کہ میں اپنے بیٹے سے درگزری، میرے شوہر کو جہاں سے ممکن ہو پیدا کرو۔"

ضو کا جواب ہے :

"از بس کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے زندہ رہنے میں ہتک حرمت اور بے پردگی سے امن متصور تھا اس وجہ سے یہ قول عین مقتضائے وقت پر ہے...... علاوہ مادر حضرت علی اکبر کے، کہ یہ تو ناموس الہی کی ناموس تھیں، جملہ مخدرات علیا، اور بعض نسوان اصحاب کرام مثل مادر حضرت وہب، ان سب نے اپنے اپنے فرزندوں کو بہ کمال رضامندی واصرار حضرت سید الشہدا روحی فداہ سے رخصت دلوا کر ان حضرت پر نثار کیا۔"

لہجے کی شوخی اور نوک جھونک والے انداز کے باوجود "رد الموازنہ" میں جوابوں کا معیار "تردید موازنہ" کے جوابوں سے بہتر ہے۔

(۱۰) حیات دبیر

(حصہ اول، سید افضل حسین رضوی ثابت لکھنوی۔ سیوک اسٹیم پریس، لاہور ۱۹۱۳ء)

کتاب کے دیباچے میں ثابت بتاتے ہیں کہ انہوں نے "موازنہ انیس و دبیر" پڑھی تو بہ طور تبصرہ اس کا جواب لکھنا شروع کیا۔ مگر جب معلوم ہوا کہ لکھنؤ میں اس کے جواب لکھے جا رہے ہیں تو ارادہ ترک کر دیا اور احباب کے اصرار پر "حیات دبیر" لکھنا شروع کر دی۔

لکھنؤ میں لکھے جانے والے جوابوں سے ثابت کی مراد ظاہرا "تردید موازنہ" اور "رد الموازنہ" ہیں۔ یہ جواب مختصر اور کچھ تشنہ سے ہیں۔ غالبًا اسی لئے ثابت نے "حیات دبیر" میں موازنے کا مفصل جواب دینے کا فیصلہ کیا۔ ان کی کتاب کا سولھواں باب اسی موضوع سے تعلق اور بجائے خود ایک کتاب کی حیثیت رکھتا ہے جس کی ضخامت (قریب ۵۵۰۰۰ الفاظ) "تردید موازنہ" اور "رد الموازنہ" کی مجموعی ضخامت کی دوگنی کے قریب ہے۔ اس باب کا عنوان ثابت نے "آفتاب میں بڑے بڑے داغ" رکھا ہے۔ باب کی تمہید میں لکھتے ہیں :

"......حال کے نجومیوں نے مان لیا ہے کہ آفتاب میں بڑے بڑے دھبے ہیں۔ مولوی شبلی صاحب کو شمس العلما کا روشن خطاب ملا۔ اس سبب سے وہ آفتاب ہوئے تو ان میں بھی داغوں کا ہونا لازمی ہو گیا۔ پس جو جو داغ ان میں یعنی ان کی کتاب "موازنہ انیس و دبیر" میں نظر آتے ہیں میں نے ان کو سات قسم پر منقسم کیا ہے۔ نمبر وار الگ الگ ہر قسم کو بیان کروں گا۔" (ص ۳۹۰)

یہ سات قسمیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ "ناواقفی، نافہمی" (۴۸ صفحے)

۲۔ "زباں دانی کی غلطیاں" (۱۲ صفحے)

۳۔ "اتہام" (۱۴ صفحے)

۴۔ "ہوشیاری" (۱۱ صفحے)

۵۔ "سخت کلامی اور بنانے چندرائے کا داغ" (۱۶ صفحے)

۶۔ "سرقہ اور مولوی شبلی صاحب کا انیس و دبیر کی طرف نسبت دینا" (۸ صفحے)

۷۔ "متفرقات (چھوٹے چھوٹے بہت سے دھبوں سے مل کر یہ داغ بنا ہے)" (۳۶ صفحے)

ان قسموں کے تحت ثابت نے جو بحثیں کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ انیس و دبیر کے مطبوعہ مرثیوں میں نقل، کتابت اور چھپائی کی بہت غلطیاں رہ پا گئی ہیں۔ معترضوں نے اکثر ان غلطیوں کو مصنفوں کی لغزشیں سمجھ کر ان پر اعتراض کیے ہیں۔

۲۔ دبیر انیس کے بہت پہلے سے مرثیہ کہہ رہے تھے۔ شروع میں انیس نے دبیر کے جواب میں مرثیے کہے، پھر دبیر نے بھی جوابی مرثیے کہے۔

۳۔ انیس کی طرح دبیر نے بھی "صاف صاف دعویٰ فرمایا ہے کہ میرے کلام سے دوسرے فائدہ اٹھاتے ہیں۔" (مثالیں)

۴۔ موازنے کے اصول کے خلاف شبلی نے دبیر کا کلام بہت کم درج کیا ہے۔

۵۔ "مولوی شبلی صاحب نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ جا بہ جا "موازنہ" میں دبیر و انیس کی زبان پر بھی اعتراض فرمائے۔ یہ امر ہر گز ان کو سزاوار نہ تھا۔" (اس لئے کہ خود ان کی زبان مستند نہیں ہے)۔

۶۔ شبلی نے ان "سنے سنائے مصرعوں کو بھی مرزا مرحوم کے سر منڈھ دیا" جو ان کے نہیں ہیں، مثلاً "زیر قدم والدہ......" یا "فرمایا میں حسینؑ ......" (ماخوذ از "ردالموازنہ")

۷۔ شاعری کا جو معیار مقرر کر کے اس پر شبلی نے انیس و دبیر کے کلام کو پرکھا ہے وہ ایشیائی شاعری کی حد تک درست نہیں ہے۔

۸۔ شبلی لکھتے ہیں کہ انیس و دبیر کے "بہت سے اشعار پر سرقے کا گمان ہو سکتا ہے۔" لیکن سرقے کی مثال میں دبیر کا ایک شعر بھی نہیں پیش کر سکے۔ علاوہ بریں وہ سرقے کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے۔

۹۔ شبلی نے دبیر کی تنقید میں سخت کلامی اور تضحیک سے کام لیا ہے۔

۱۰۔ کلام انیس پر اعتراض کرتے ہوئے شبلی کہتے ہیں کہ ان کے جواب میں ہر جگہ طباعت کی غلطی کا عذر تسلیم نہیں کیا جا سکتا، درحالے کہ خود "موازنہ" میں طباعت کی بہت غلطیاں ہیں (مثالیں)۔ یہ کتاب مطبع مفید عام آگرہ میں چھپی ہے "اور یہ مطبع صوفی صاحب کا خوش خطی و صحت میں مشہور بھی ہے۔ بایں ہمہ یہ غلطیوں کی کثرت ہے تو دوسرے معمولی مطبعوں میں کس قدر زیادہ غلطیاں ہوتی ہوں گی۔"

۱۱۔ انیس کی غلطیوں کی نشان دہی کے جواز میں شبلی کہتے ہیں کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو عوام، جن کو نیک و بد کی تمیز نہیں ہوتی، اکابر کی غلطیوں کی بھی تقلید کرتے ہیں اور اس کا برا اثر پھیلتا چلا جاتا ہے۔ "میں کہتا ہوں کہ مولوی شبلی کا شمار بھی اکابر قوم میں ہے کہ وہ شمس العلما ہیں۔ میں نے بھی یہی خیال کیا کہ مولوی صاحب کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کا اثر زہر کی طرح قوم و ملک میں پھیل جائے گا اور لوگ ان کی غلطیوں کی تقلید کرنے لگیں گے، اس لئے ان کی غلطیوں کو آفتاب کی طرح واضح کر دکھایا"۔

دبیر کے کلام پر شبلی کے اعتراضوں کے جواب ثاقب نے تفصیل سے دیے ہیں اور کسی بھی اعتراض کو صحیح تسلیم نہیں کیا ہے۔ ایک اعتراض اور اس کا مختصر جواب نقل کیا جاتا ہے:

"صفحہ ۲۸۳ پر میر صاحب کے دو مصرعے، (۱) "گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا" (۲) "گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا" لکھ کر یہ لکھا ہے کہ دیکھیے ہر موقع پر گھوڑے کی تشبیہ کیسی اچھی نظم کی ہے۔ پھر عنان عنایت مرزا صاحب کی جانب مولوی صاحب نے معطوف فرمائی ہے۔ یہ بیت لکھ کر

وہ رخش پہ، یا دیو تھا اسوار پری پر

غل رن میں اٹھا کوہ چڑھا کبک دری پر

فرماتے ہیں کہ "کس قدر بیہودہ تشبیہ ہے۔ دشمن کو کوہ اور گھوڑے کو کبک دری کہنا مضائقہ نہیں لیکن کوہ کا کبک دری پر چڑھنا کس قدر مہمل ہے۔"

میں کہتا ہوں مولوی صاحب، آپ نے بھی ملک عرب کی سیر کی ہے، کچھ حصہ عراق عرب کا میں نے بھی دیکھا ہے جہاں کے عراقی گھوڑے مشہور ہیں۔ فرمایئے، کیسے دبلے پتلے خوب صورت گھوڑے ہوتے ہیں۔ ان کو کبک دری اور پری سے اور قوی ہیکل پہلوان سوار کو دیو اور پہاڑ سے تشبیہ دینا کیسی معقول تشبیہ، مع مبالغہ، ہے۔ اور جب گھوڑا کبک دری اور سوار کوہ ہوا تو ضرور یہ کہا جائے گا کہ کبک دری پہ کوہ چڑھا۔ مطلب یہ ہے کہ کوہ پر کبک دری ہوا کرتا ہے، مگر اس موقع پر الٹی بات نظر آتی ہے۔ آپ کے سر کی قسم، تشبیہ نہ بیہودہ ہے نہ مہمل، بلکہ صنعت تضاد ہے جہاں تک جناب کا ذہن نہیں پہنچا۔ یہ ایشیائی ادب وشاعری کی جان ہے۔ آپ بیہودہ فرماتے ہیں۔ خدا سمجھ دے۔ میں نہ آپ کو بیہودہ، نہ آپ کے ارشاد کو مہمل کہوں گا۔ عرب و عجم و ہندی و اردو کے شاعروں کے کلام ایسی تشبیہات اور ایسے الفاظ سے بھرے پڑے ہیں۔ کسی پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ اگر یہی جرم ہے کہ مرزا دبیر مرحوم نے بھی ایسی تشبیہ، مع مبالغہ، نظم فرمائی تو اس کا جواب نہیں۔" (ص ۶۷۔۵۶۶)

"حیات دبیر" کے دوسرے ابواب میں ثاقب کا عمومی لہجہ متوازن ہے اور متنازعہ

موضوعات پر بحث اور اپنے ممدوح کی مدافعت اور اپنے خلاف طبع چیزوں کے ذکر میں بھی وہ بردباری کا رویہ برقرار رکھتے ہیں۔ لیکن شبلی سے بحث میں ان کا انداز بدلا ہوا ہے۔ وہ بار بار غصے میں آجاتے ہیں، شبلی پر طرح طرح کے فقرے کستے ہیں اور مذہبی چوٹیں بھی کرتے ہیں۔

(۱۱) المیزان

(سید نظیر الحسن رضوی فوق مہابنی، مطبع فیض عام، علی گڑھ ۱۹۱۴ء)

"المیزان" معرکہ انیس و دبیر کے سلسلے کی دست یاب کتابوں میں سب سے ضخیم اور موازنے کے جوابوں میں سب سے اہم ہے۔ تخمیناً دو لاکھ الفاظ (۶۱۰ صفحات) پر مشتمل اس کے بیرونی سرورق کی نقل حسب ذیل ہے:

"وزنوا القسطاس المستقیم :(سورہ شعراء)

(اور ترازو کی ڈنڈی سیدھی رکھ کر تولا کرو)

المیزان

یعنی مولوی شبلی نعمانی کی کتاب موازنہ انیس و دبیر پر محققانہ اور منصفانہ ریویو اور مرزا دبیر کی شاعری پر تفصیلی بحث، اور ان کی ہر قسم کی سلیس اور صاف نظم کا نمونہ اور ان کے محاسن سخن اور فصاحت و بلاغت کلام کا مشرح تذکرہ

مولفہ

عالی جناب مولوی چودھری سید نظیر الحسن صاحب فوق رضوی

رئیس مہابن ضلع متھرا

محمد عبداللطیف پرنٹر کے اہتمام سے

مطبع فیض عام علی گڑھ میں چھپی

اور جناب مولف کتاب نے مہان سے شائع کی......"

اندرونی سرورق کی عبارت بھی کم و بیش یہی ہے، البتہ اس میں یہ فقرہ بھی ہے:

"اور میر انیس و مرزا دبیر پر اعتراضات کے مدلل و مفصل جوابات"

تقابلی مطالعے کی حیثیت سے موازنے کی اس خامی کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے کہ اس میں کلام دبیر سے بہت کم مثالیں دی گئی ہیں اور یہ مثالیں دبیر کے اس کلام سے لی گئی ہیں جو شبلی کی رائے میں عیب دار اور قابل اعتراض ہے۔ اس طرح موازنے کا جواب لکھنے والوں کے سامنے دو طریقے تھے۔ ایک یہ کہ کلام دبیر پر شبلی کے اعتراضوں کی تردید کی جائے، دوسرا اور بہتر طریقہ یہ کہ دبیر کے یہاں سے بہ کثرت مثالیں دے کر ثابت کیا جائے کہ ان کے یہاں بھی وہ محاسن فراوانی کے ساتھ ملتے ہیں جو انیس کے یہاں موجود ہیں۔ ثاقب نے پہلے طریقے پر زور دیا، فوق نے دوسرے پر۔ اس طرح "المیزان" اور "موازنۂ انیس و دبیر" مل کر دونوں شاعروں کے تقابلی مطالعے اور موازنے کے لئے کافی ہو جاتی ہیں۔

"المیزان" اور "حیات دبیر" کی تصنیف اور طباعت کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے اور فوق اور ثاقب کے پیش نظر ایک دوسرے کی کتاب نہیں تھی اس لئے دونوں کے یہاں بعض باتیں مشترک ہیں۔ فوق نے "المیزان" کی تمہید میں ثاقب اور "حیات دبیر" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا بھی ہے:

"اس امر کا افسوس ہے کہ ان کی کتاب اور میری کتاب ایک ہی زمانے میں پریس میں بھیجی گئیں، اس لئے نہ تو میں ان کی کتاب سے مستفیض ہو سکا، نہ ان کو میری کتاب دیکھنے کا موقع ملا۔ شاید کسی مقام پر توارد ہو گیا ہو تو معلوم نہیں۔" (ص ۵۔۴)

ثاقب بھی شبلی کے ایک اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے "حیات دبیر" میں لکھتے ہیں:

"......اس کا جواب "المیزان"، تالیف لطیف منشی چودھری سید نظیر الحسن صاحب رئیس مہان، میں ملاحظہ فرمائیں جو چھپ رہی ہے۔" (ص ۱۰۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ثامت کو "المیزان" کے بعض مباحث کا علم تھا، اور یہ بھی کہ "المیزان" "حیات دبیر" کے مکمل ہونے سے پہلے پریس میں چلی گئی تھی، البتہ اس کی طباعت "حیات دبیر" کے بعد مکمل ہوئی (اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "المیزان" بہت اہتمام سے چھاپی گئی ہے اور اردو طباعت کے اعلیٰ نمونوں میں رکھی جا سکتی ہے)۔

ثامت کی طرح فوق بھی شکایت کرتے ہیں کہ شبلی نے

"مرزا دبیر کی مخالفت کے جوش میں...... بعض جگہ غلط شعر لکھ کر اور بعض جگہ چند اشعار یا بند حذف کر کے اعتراض قائم کر دیا ہے۔ بعض موقعوں پر دوسروں کے اشعار ان کی جانب منسوب کر کے اعتراض کیا ہے۔" (ص ۱۳) اور

"ہم کو ان سوقیانہ الفاظ پر بھی اعتراض اور افسوس ہے جو شبلی صاحب نے مرزا صاحب جیسے عالم و عابد، دیں دار و خدا پرست، زاہد و متقی، پاک باطن، پاک نفس، مقدس و واجب التعظیم بزرگ کی نسبت اکثر مواقع پر لکھے ہیں۔ ایک مسلمان اور ذی علم شخص سے یہ امر کس قدر تعجب خیز معلوم ہوتا ہے کہ وہ بزرگان قوم اور مداحان اہل بیت علیہم السلام کا احترام بالکل فراموش کر دے۔ ممکن ہے کہ مولوی صاحب مرزا صاحب کے کلام کی عظمت نہ کریں، لیکن کم سے کم ان کی ذات بابرکات کا تو ادب و وقار ملحوظ رکھنا چاہئے تھا۔" (ص ۳)

"المیزان" میں مباحثے کا میدان اس طرح ہے:

۱۔ شبلی نے دبیر کے کلام سے مثالیں دے کر جن باتوں کو قابل اعتراض قرار دیا ہے فوق انیس کے کلام سے مثالیں دے کر کہتے ہیں کہ یہ باتیں انیس کے یہاں بھی موجود ہیں۔

۲۔ شبلی دونوں شاعروں کا متحد المضمون کلام پیش کر کے انیس کے کلام کو بہتر بتاتے ہیں۔ فوق کا کہنا ہے کہ شبلی کی پیش کردہ مثالوں سے ان کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔

۳۔ شبلی نے انیس کا بہت سا ایسا کلام درج کیا ہے جو ان کی رائے میں دبیر کے کلام سے بہتر ہے۔ "المیزان" میں دبیر کا ایسا بہت سا کلام نقل کیا گیا ہے جس میں فوق کی رائے کے مطابق دبیر آگے بڑھے ہوئے ہیں۔

فوق نے اس طریق کار کو بہت شائستگی کے ساتھ اختیار کیا ہے اور اتنی ہی شائستگی کے ساتھ کتاب کی تمہید میں اس کی صراحت اور توجیہ بھی کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"ہماری کتاب پڑھتے وقت ناظرین یہ امر بھی ملحوظ خاطر رکھیں کہ گو ہم یہ کتاب مرزا دبیر صاحب کے دفع الزام کے واسطے لکھ رہے ہیں، لیکن میر صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ کی نسبت، جن کا اعتقاد ہم کو مولوی شبلی صاحب سے بہت زیادہ ہے، کوئی خلاف ادب لفظ نہیں لکھا۔ جن مقامات پر مولوی شبلی صاحب نے مرزا صاحب پر اعتراضات کیے ہیں کہ انھوں نے فلاں مضمون یا فلاں لفظ خلاف بلاغت و فصاحت لکھا ہے، اس کے جواب میں ہم نے اسی قسم کے اشعار میر صاحب مرحوم کے درج کیے ہیں۔ اس سے خدانہ خواستہ یہ مطلب نہیں ہے کہ میر صاحب پر کوئی اعتراض کیا جاتا ہے، بلکہ مرزا صاحب پر جو اعتراض کیا گیا ہے اس کے رفع کرنے کی غرض سے میر صاحب کے کلام سے استناد کیا ہے، یعنی از بسکہ میر صاحب نے بھی ایسا لکھا ہے اس لئے صحیح ہے اور یہ لفظ مولوی شبلی صاحب کے نزدیک قابل اعتراض نہ ہونا چاہئے تھا۔ غالباً مولوی صاحب کے ساکت کرنے کے واسطے اس سے بہتر کوئی تدبیر نہ تھی کہ میر صاحب کا کلام بہ طور سند پیش کیا جائے۔" (ص ۳۔۴)

"چونکہ یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ کسی شاعر کا کلام بہ لحاظ فصاحت وبلاغت، شستگی وروانی یکساں نہیں ہوتا، اس لئے اس کلیے کے مطابق میر صاحب اور مرزا صاحب کے کلام میں بھی تین مدارج ہیں۔ اول، جہاں کسی مشترک مضمون کے ادا کرنے میں میر صاحب بڑھ گئے ہیں۔ دوسرے، جہاں مرزا صاحب کو فضیلت حاصل ہے۔ تیسرے، جہاں دونوں صاحبوں کا کلام بہ لحاظ فصاحت وبلاغت وطرز بیان یکساں واقع ہوا ہے۔ امر اول مولوی شبلی صاحب نے اپنی کتاب میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی آخر کتاب موازنہ میں انھوں نے وہ متحد المضمون اشعار لکھے ہیں جہاں میر صاحب بڑھ گئے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان کا انتخاب غلط اور ناقص ثابت ہوا، اس وجہ سے ہم کو مجبوراً ان کے خیال کی تردید کرنی پڑی ہے۔ کاش مذاق صحیح اور وجدان سلیم ان کی رہ نمائی کرتا اور ان کی پر زور طبیعت لطافت اشعار اور حسن کلام کو بہ

خوبی جانچ سکتی تو میر صاحب کا ایسا نفیس کلام بہت مل سکتا تھا جہاں وہ فی الواقع مرزا صاحب سے بڑھ گئے ہیں۔ امر دوم کو، یعنی جہاں مرزا صاحب کے کلام کو ترجیح ہے، ہم نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ امر سوم، یعنی جہاں دونوں صاحبوں کا کلام یکساں واقع ہوا ہے، یہ مقامات نہایت دل چسپ و دل آویز، پر لطف اور قابل دید ہیں جہاں پر ایک باکمال شاعر کی قابلیت، قادر الکلامی، زور طبیعت اور خصوصیات کلام کا خوب اندازہ ہوتا ہے اور نکتہ سنج ناظرین معلوم کر سکتے ہیں کہ دونوں بزرگوں نے اپنی دل کش نظموں میں ایک ہی قسم کے واقعے کو الگ الگ انداز سے ادا کر کے کلام میں کس قدر جوش اور اثر پیدا کر دیا ہے۔ ہم نے اس مقام کو مختصراً کچھ لکھا بھی تھا لیکن چونکہ کتاب کا حجم بڑھ گیا تھا اور یہ بحث بہت وسیع اور ایک علیحدہ تالیف کی متقاضی تھی اس لئے اس مقام کو بالکل چھوڑ دیا۔" (ص ۳۔ ۴)

"موازنہ" کی طرح "المیزان" میں بھی فن شاعری سے متعلق عمدہ تنقیدی مباحث اور لطیف نکات ملتے ہیں، خصوصاً دبیر کی مرثیہ گوئی پر اسے بہترین کتابوں میں شمار کیا جا سکتا ہے، لیکن اس حیثیت سے موازنے کی طرح اس کتاب کا بھی جائزہ ہمارے موضوع سے باہر ہے، اس لئے کتاب کے چند ایسے اقتباس پیش کئے جاتے ہیں جو ہمارے دائرہ کار میں آتے ہیں:

"(شبلی نے دبیر کے) دل کش و دل آویز کلام کی طرف سے آنکھ بند کر لی یا دیدہ و دانستہ تلاش کی زحمت گوارا نہیں کی کیونکہ مرزا صاحب کا ایسا ہی دلچسپ اور فصیح کلام درج کتاب کرنا ان کے مقصود کے خلاف تھا...... یہ جواہر بے بہا ان کو نظر کیوں آتے۔ انہوں نے تو مرزا صاحب کا کلام سرسری طور پر محض اعتراضات تلاش کرنے کی نیت سے کہیں کہیں دیکھ لیا۔ اگر خوش نیتی اور حسن اعتقاد سے دیکھتے تو اس میں سب کچھ مل جاتا۔ (ص ۴۲ بعد۔ بہ کثرت مثالیں)

"(شبلی) میر صاحب کے کلام میں تشبیہ کی خوبیوں کا اظہار کرتے ہیں۔ اتنا ہم بھی ان کے ہم خیال ہیں کہ "تشبیہ کی قابل قدر خوبیاں میر انیس صاحب کے کلام میں پائی جاتی

ہیں، " سوا اس فقرے کے کہ "اردو زبان میں ان کی نظیر نہیں مل سکتی۔" اس لئے کہ انہی کے مقابل میں ہم ایک دوسرے بلیغ اور نازک خیال شاعر مرزا دبیر صاحب کے کلام سے بھی چند ایسے ہی دل کش اور دل فریب نمونے پیش کرتے ہیں جس سے ان کا کلیہ باطل ہو جاتا ہے۔" (ص ۱۵۱ بعد۔ مثالیں)

"(واقعات شام کو) لائق مولف...... بالکل نظر انداز کر گئے۔ مشہور ہے کہ زندان شام اور ہند (زوجہ یزید) کے حالات کو مرزا صاحب نے نہایت پر تاثیر انداز سے لکھا ہے۔" (ص ۲۷۰ بعد۔ مثالیں)

(لیکن شبلی نے زندان شام کے حال میں انیس اور دبیر کے ایک ایک مرثیے کے کچھ بند نقل کئے ہیں۔)

"(شبلی نے) فریقین میں چلوانا اور اسی پردے میں اپنی تالیف بلکہ خود اپنے کو فروغ دینا چاہا ہے۔" (ص ۵۱۸)

موازنے پر فوق کا مجموعی تبصرہ یہ ہے:

"میر انیس نے اپنے عام پسند انداز میں پورا کمال حاصل کر لیا تھا، اس لئے وہ اپنے طرز میں یکتا سمجھے جاتے ہیں۔ پس بہتر تھا کہ لائق مصنف ان کے محاسن سخن پر قلم فرسائی کرنے ہی پر اقتصار کرتے اور ان کے کلام کے وہ جواہر پبلک کے سامنے پیش کرتے جو ایک فصیح و بلیغ شاعر کے واسطے مایہ ناز اور سخن فہموں کے لیے باعث انبساط ہو سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کی تالیف کو ہر شخص دل چسپی اور عزت کی نگاہوں سے دیکھتا اور نہ صرف انیسیوں بلکہ منصف مزاج دبیریوں کے لئے بھی باعث مسرت ہوتی، لیکن اس کے ساتھ ہی بلا ضرورت مرزا صاحب کے فرضی اور اتہامی معائب کا بیان کر کے انہوں نے اپنی بیش بہا کتاب کو نہ صرف دبیریوں بلکہ مہذب اور شائستہ انیسیوں میں بھی ہر دل عزیز ہونے سے محروم رکھا جس کا سب سے زیادہ ہم کو افسوس ہے۔ یہ امر کہ لائق مولف کو میر صاحب کے کلام سے خاص انس ہو، کسی طرح ناموزوں نہیں سمجھا جا سکتا، لیکن ساتھ ہی یہ خیال کہ وہ مرزا

صاحب کے کلام کو قابل قدر خیال نہ کریں ضرور قابل گرفت ہے جس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ دبیریوں کو جن میں بڑے بڑے فاضل اور یگانہ عصر بزرگ شامل ہیں نافہم اور غیر سخن سنج سمجھے ہوئے ہیں۔" (ص ۱۵)

"سب سے زیادہ تعجب خیز امر یہ کہ قابل مولف نے جہاں میر صاحب کی بیجا مدح سرائی حد سے زیادہ کی ہے وہیں باایں ہمہ حسن اعتقاد ان پر سرقے کے الزام بھی حد سے زیادہ لگائے ہیں اور بہت سی چھوٹی چھوٹی غلطیاں ان کے نفیس کلام میں نکالی ہیں۔ اگرچہ ہم اپنے اعتقاد میں، جو مولف سے بہت زیادہ ہے، میر صاحب کو ان الزامات سے پاک سمجھتے ہیں لیکن ان کے الزامات کے مطابق اگر خدانخواستہ وہ غلطیاں ان کے کلام میں مان لی جائیں تو ان کا عظیم الشان رتبہ ایک مبتدی شاعر سے بھی گھٹ جاتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں۔ چنانچہ میں نے اس کتاب میں مختصراً ان اعتراضات کا بھی جواب دیا ہے جو مولف نے نہایت بے دردی سے میر صاحب جیسے باکمال پر لگائے ہیں۔" (ص ۱۵)

یعنی فوق نے موازنے کے جواب میں دبیر کے ساتھ انیس کی بھی مدافعت کی ہے۔ ثاقب کا رویہ بھی کچھ ایسا ہی ہے، اور اس طرح جواب دینے والوں نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ موازنہ انیس و دبیر دونوں کے خلاف لکھا گیا ہے لیکن دبیر اس کا خاص نشانہ ہیں۔

(۱۲) جواب موازنہ

(سید ذوالفقار حسین خاں جون پوری)

موازنے پر بحث کے ضمن میں ثاقب نے سید ذوالفقار حسین خاں جون پوری کے ایک مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے "حیات دبیر" (۲) میں یہ بھی اطلاع دی ہے:

"ان سید صاحب نے بھی موازنہ مولوی شبلی صاحب کا جواب لکھا ہے۔ خدا کرے وہ بھی

جلد چھپے۔" (ص ۶۰۳)

"تجبیہ" کی طرح اس کتاب کی بھی مطبوعہ اشاعت (بلکہ نام بھی) ہمارے علم میں نہیں ہے۔

☆..................☆..................☆

شبلی کی علمی ادبی شخصیت اردو دنیا میں بہت ممتاز تھی، لیکن ان کی تصنیفوں کا تعلق زیادہ تر اسلامیات، تاریخ اور فارسی ادب سے تھا۔ "موازنہ انیس و دبیر" براہ راست اردو ادب سے تعلق رکھتی تھی اس لئے اس کو خاص توجہ سے دیکھا گیا۔ رسالوں میں اس پر تبصرے اور مضمون لکھے گئے جن میں اسے ایک بڑے شاعر اور بڑی شاعری پر اعلیٰ معیار کی تنقیدی کتاب تسلیم کیا گیا۔ گاہ گاہ دبیر کے ساتھ ان کے رویے سے اختلاف بھی کیا گیا، لیکن ہم نے معرکہ انیس و دبیر کے سلسلے میں موازنے کے صرف ان جوابوں سے سروکار رکھا ہے جو کتابی صورت میں لکھے گئے ہیں۔

ان جوابوں میں ایک تاثر یہ بھی دیا گیا ہے کہ موازنے میں شبلی کا اصل مقصد انیس و دبیر دونوں کی منقصت کرنا ہے۔ گویا نفس مضمون کے لحاظ سے موازنہ انیس و دبیر اور نساخ کی "انتخاب نقص" ایک ہی نوعیت کی کتابیں ہیں۔ لیکن ان دونوں کتابوں کا تقابلی مطالعہ اس تاثر کی تائید نہیں کرتا۔ نساخ اپنی کتاب کے دیباچے میں بتاتے ہیں کہ جب انہوں نے انیس و دبیر کا مطبوعہ کلام دیکھا تو اس میں طرح طرح کے سقم پائے اور معلوم ہوا کہ یہ دونوں اتنے عمدہ شاعر نہیں ہیں جتنی ان کی شہرت ہے۔ البتہ نساخ یہ بھی لکھتے ہیں:

"جو لوگ کہ جناب مرزا دبیر کو جناب میر انیس پر ترجیح دیا کرتے تھے، وہ امر بھی برخلاف معائنہ ہوا کہ مرزا صاحب کے کلام میں بہت زیادتی سے نقصان دیکھا اور میر صاحب کے کلام میں اس سے بہت کم خلل پایا۔" (ص ۲)

چنانچہ "انتخاب نقص" میں "اغلاط مرثیہ مرزا دبیر صاحب" کے زیر عنوان بیس صفحوں میں اور "اغلاط مرثیہ میر انیس صاحب" کے تحت صرف چھ صفحوں میں اعتراض کئے گئے ہیں۔ نساخ انیس و دبیر دونوں کو کمی بیشی کے فرق کے ساتھ غلط گو ثابت کرنا چاہتے ہیں اس

لئے دونوں کے کلام میں صرف اغلاط اور معائب کا اظہار کرتے ہیں۔ شبلی کا رویہ مختلف ہے۔ وہ انیس کو بہت بڑا شاعر ثابت کر رہے ہیں اور تفصیل کے ساتھ ان کے کلام کی خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہیں، البتہ انہیں سہو و خطا سے مبرا نہیں سمجھتے۔ ان کے کلام کے کچھ معائب بھی بیان کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ میر انیس کے کلام میں اس قسم کی غلطیاں ضرور موجود ہیں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جس قدر قادر الکلام اور پر گو شعرا گزرے ہیں، سب کی یہی حالت ہے۔ فردوسی سے بڑھ کر کون قادر الکلام ہو گا، متاخرین میں قاآنی کا جواب نہیں، ان دونوں کے کلام میں اس قسم کی بے اعتدالیاں نہایت کثرت سے موجود ہیں۔ لوگ ان شعرا کو نمونہ بناتے ہیں جن کی شاعری کا دائرہ چند عشقیہ خیالات تک محدود ہے۔ لیکن جو شخص سیکڑوں قسم کے مختلف واقعات کو شعر میں ادا کرنا چاہتا ہے، ان مسامحات سے کیونکر بچ سکتا ہے۔ اس لئے قادر الکلام شعرا کو اس جرم سے بری رکھنا چاہئے۔" (ص ۲۳۰)

لیکن دبیر کو شبلی اس جرم سے بری رکھنے پر تیار نہیں ہیں اس لئے کہ وہ دبیر کو قادر الکلام شعرا میں شمار نہیں کرتے۔ ان کا وہ اقتباس درج کیا جا چکا ہے جو "شاعری کس چیز کا نام ہے؟" سے شروع ہوتا ہے اور جس میں وہ شاعری کے اوصاف بیان کر کے پوچھتے ہیں، "ان تمام اوصاف میں سے کون سی چیز مرزا دبیر میں پائی جاتی ہے؟" پھر دبیر کے کلام کی کمزوریاں گناتے ہیں۔ وہ دبیر کے کلام میں شعری محاسن کی موجودگی کا کلیتاً انکار نہیں کرتے لیکن کلام دبیر کے محاسن کو دبیر کے ذاتی جوہر کی نمود نہیں مانتے۔ ان کے اس بیان کا ذکر آ چکا ہے کہ دبیر کے کلام میں جو خوبیاں ملتی ہیں وہ کچھ تو لاکھوں شعر کہنے کی وجہ سے، گویا اتفاقیہ طور پر، اور کچھ اخیر عمر میں انیس کی تقلید کرنے کی وجہ سے آ گئی ہیں۔

دبیر پر انیس کو صریحاً ترجیح دینے کے باوجود موازنے کے جوابوں میں شبلی کو دونوں استادوں کی مخالفت کا ملزم گردانا گیا۔ اس کا سبب موازنے کو معرکہ انیس و دبیر کے تناظر میں دیکھنے پر سمجھ میں آتا ہے۔ انیسیے اور دبیریے فریق مخالف کے ممدوح کے کلام کی بعض خوبیوں کا

تو گاہ گاہ اعتراف کر لیتے تھے لیکن اپنے ممدوح کے کلام کے خلاف کچھ کہنے کا کیا ذکر، کچھ سننے پر بھی تیار نہیں تھے۔ اس صورت حال میں شبلی کا دونوں استادوں کے یہاں خامیوں کی نشاندہی کر دینا اس گمان میں ڈال سکتا تھا کہ وہ انیس اور دبیر دونوں کے مخالف ہیں۔

☆..................☆..................☆

ماخذوں کی فہرست

۱۔	"آبِ حیات" :	محمد حسین آزاد، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۲ء
۲۔	"اعمال نامہ" :	سر سید رضا علی، ہندوستان پبلشرز، دہلی ۱۹۴۳ء
۳۔	"اہلمیزان" :	چودھری سید نظیر الحسن رضوی فوق مہانی، مطبع فیض عام علی گڑھ ۱۹۱۳ء
۴۔	"انتخاب نقص" :	عبدالغفور خاں نساخ (تالیف ۱۲۹۳ھ)، مطبع نظامی کان پور محرم ۱۲۹۶ھ جنوری ۱۸۷۹ء (یہ کتاب بہت کمیاب ہے۔ عزیز دوست اسلم محمود صاحب کا ممنون ہوں جنھوں نے ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخے کی عکسی نقل مرحمت کی۔ نیر مسعود)
۵۔	"انیسیات" :	سید مسعود حسن رضوی ادیب، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۷۶ء
۶۔	"باقیات دبیر" :	مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری، ناشر مرتب ۱۹۹۴ء
۷۔	"بدر کامل" : (اسم تاریخی "گلستان خبیر") :	سید سرفراز حسین رضوی خبیر لکھنوی، نظامی پریس، لکھنؤ ۱۹۵۶ء
۸۔	"بیاض مولوی سید علی تقی مجتہد" :	مملوکہ حکیم سید علی آشفتہ لکھنوی، اقتباس ذخیرۂ ادیب، لکھنؤ
۹۔	"بیان میر تقی: حیات و شاعری" :	ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ناشر محمد رفیع الدین، ناگپور ۱۹۸۰ء

۱۰۔	"بیان میر نواب علی شال فروش":	نوشتہ مسعود حسن رضوی ادیب، مورخہ ۵ اکتوبر ۱۹۳۹ء، ذخیرہ ادیب، لکھنؤ
۱۱۔	"بیان نواب محمد حسین کوثر کان پوری":	نوشتہ نیر مسعود۔ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۷۸ء
۱۲۔	"تاریخ لکھنؤ":	زبدۃ العلما سید آغا مہدی لکھنوی۔ ناشر جمعیت خدام عزا، کراچی ۱۹۷۶ء
۱۳۔	"تجلیات" (اسم تاریخی "تاریخ عباس")	مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، نظامی پریس، لکھنؤ
۱۴۔	"تذکرہ میر انیس صاحب مرحوم لکھنوی":	حافظ حاجی حفیظ الدین احمد مزاج دہلوی، صدیقی پریس، بنارس، مئی ۱۹۰۷ء
۱۵۔	"تردید موازنہ":	شیخ محمد جان عروج فیض آبادی، نوشتہ حسن رضا مطبع تصویر عالم، لکھنؤ
۱۶۔	"تنبیہ" (جواب "حیات دبیر پر ایک نظر"):	قاضی فقیر علی عاقل اپولی انصاری (بہ حوالہ "حیات دبیر")
۱۷۔	"تنقید آب حیات":	میر محمد رضا ضمیر۔ اردو پریس، لکھنؤ
۱۸۔	"توشہ آخرت":	واجد علی شاہ اختر۔ مطبع سلطانی، کلکتہ ۱۲۹۹ھ
۱۹۔	جواب موازنہ (اصل نام نامعلوم)	ذوالفقار حسین جون پوری (بہ حوالہ "حیات دبیر")
۲۰۔	"حیات انیس":	سید امجد علی اشہری لکھنوی، مطبع آگرہ اخبار ۱۳۴۳ھ (۲۵۔۱۹۲۴)
۲۱۔	"حیات دبیر" (جلد اول):	سید افضل حسین رضوی ثابت لکھنوی۔ سیوک اسٹیم پریس، لاہور ۱۹۱۳ء
۲۲۔	"حیات دبیر" (جلد دوم):	سید افضل حسین رضوی ثابت لکھنوی۔ چارج اسٹیم پریس، لاہور ۱۹۱۵ء
۲۳۔	"خوش معرکہ زیبا":	سعادت خان ناصر۔ مرتبہ مشفق خواجہ۔ مجلس ترقی ادب۔ لاہور ۱۹۷۰ء

۲۴۔	"دربار حسین" (اسم تاریخی "چراغ مجالس"):	سید افضل حسین رضوی ثابت لکھنوی۔ مطبع اثنا عشری۔ دہلی ۱۹۲۲ء
۲۵۔	"دفتر ماتم": جلد سوم:	مراثی مرزا سلامت علی دبیر، مطبع شاہی، لکھنؤ بہ فرمائش سید عبدالحسین تاجر کتب، لکھنؤ بار دوم ۱۹۱۳ء
۲۶۔	......"...... جلد ششم	مطبع جعفری۔ لکھنؤ۔ بہ فرمائش حسن مرزا عاقل و مرزا امام الدین لکھنوی
۲۷۔	......"...........	مطبع دبدبہ احمدی، لکھنؤ۔ بہ فرمائش سید عبدالحسین ۱۸۹۷ء
۲۸۔	......"...... جلد ہفتم	مطبع شاہی لکھنؤ۔ بہ فرمائش سید عبدالحسین، بار دوم ۱۹۱۳ء
۲۹۔	......"...... جلد دوازدہم	مطبع نامعلوم۔ بہ فرمائش سید عبدالحسین ۱۸۹۷ء
۳۰۔	......"...... شانزدہم (سلام ہائے دبیر و تلامذہ)	مطبع دبدبہ احمدی، لکھنؤ۔ بہ فرمائش سید عبدالحسین
۳۱۔	......"...... جلد ہفدہم	مطبع دبدبہ احمدی، لکھنؤ۔ بہ فرمائش سید عبدالحسین ۱۸۹۷ء
۳۲۔	......"...... جلد نوزدہم	بہ فرمائش سید عبدالحسین ۱۸۹۷ء
۳۳۔	......"...... جلد بیستم (رباعیاں، نوحے، متفرقات از دبیر):	مطبع دبدبہ احمدی۔ بہ فرمائش عبدالحسین ۱۸۹۷ء (بہ حوالہ "المیزان"۔ تفصیل طباعت ماخوذ از "تلاش دبیر"۔ کاظم علی خان)
۳۴۔	"دولھا صاحب عروج":	مرتبہ نیر مسعود، اردو پبلشرز، لکھنؤ ۱۹۸۰ء
۳۵۔	"دیوان آغا حجو شرف":	سیادت حسن سید جلال الدین حیدر خان شرف لکھنوی۔ مطبع جعفری لکھنؤ
۳۶۔	"دیوان فصاحت عنوان"	(مجموعہ سلام ہائے میر نواب مونس) مطبع شاہی، لکھنؤ: بہ فرمائش سید عبدالحسین۔ بار دوم ۱۹۱۳ء

۳۷۔	"دیوان ناسخ"	شیخ امام بخش ناسخ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ آٹھویں بار ۱۹۲۳ء
۳۸۔	"رباعیات دبیر":	مرتبہ سید سرفراز حسین رضوی خبیر لکھنوی۔ نظامی پریس، لکھنؤ
۳۹۔	"رباعیات و سلام ہائے خاندان انیس":	مکتوبہ ۷ ذی الحجہ ۱۳۰۶ھ (؟)
۴۰۔	"رد الموازنہ":	سید افضل علی ضو لکھنوی۔ مطبع تصویر عالم، لکھنؤ ۱۳۲۶ھ
۴۱۔	"رد واقعات انیس":	سردار میرزا۔ اصح المطابع، لکھنؤ ۱۹۰۸ء
۴۲۔	"روح انیس":	مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ کتاب نگر، لکھنؤ طبع سوم ۱۹۶۳ء
۴۳۔	"سبع مثانی" (مراثی مرزا دبیر):	مرتبہ سید سرفراز حسین رضوی خبیر لکھنوی۔ مقدمہ از افضل حسین ثابت۔ نظامی پریس، لکھنؤ ۱۹۳۰ء
۴۴۔	"سلطان عالم واجد علی شاہ":	سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ آل انڈیا میر اکادمی، لکھنؤ ۱۹۷۷ء
۴۵۔	"سنان دل خراش" (جواب "انتخاب نقص"):	سید اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی، نقل مخطوطہ شمس آباد، لکھنؤ یونیورسٹی ٹیگور لائبریری
۴۶۔	"سوانح لکھنؤ" (سفرنامہ):	نجابت حسین خان عظیم آبادی۔ مجلہ معاصر پٹنہ۔ شمارہ ۱۸ جولائی ۱۹۶۳ء
۴۷۔	"شکوہ شاکی" (اسم تاریخی "گزارش خبیر" جواب "میر مونس اور حیات دبیر"):	سید سرفراز حسین رضوی خبیر لکھنوی۔ نور المطابع لکھنؤ ۱۳۲۰ھ)
۴۸۔	"شمس الضحیٰ" (احوال مرزا دبیر):	ابو محمد معروف بہ صفدر حسین تحفہ از بہادر حسین وحید مطبع اثنا عشری لکھنؤ ۱۲۹۸ھ (؟)

۴۹۔	"شمع تعزیت":	سید محمد عنایت حسین متین سامانی سارن پوری، مطبع روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی، بریلی ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء)
۵۰۔	"فکر بلیغ" (قلمی):	سید علی محمد شاد عظیم آبادی، نقل مسودہ مصنف بہ مقابلہ و تصحیح از ادیب، ذخیرہ ادیب لکھنؤ
۵۱۔	"کلیات ناسخ":	شیخ امام بخش ناسخ۔ مطبع سولائی۔ لکھنؤ
۵۲۔	"کچھ میر انیس اور ان کے سلام کے بارے میں" (مضمون):	ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ سہ ماہی "رثائی ادب"، کراچی، میر انیس نمبر، اپریل ۱۹۹۷ء
۵۳۔	"لائف" (سوانح عمری علامہ غلام حسنین کنتوری)	نوشتہ حبیب حسین۔ خادم التعلیم اسٹیم پریس، لاہور
۵۴۔	"لکھنؤ" (رپورٹ):	اودھ اخبار، لکھنؤ ۱۲ اپریل ۱۸۷۰ء / ۱۰ محرم ۱۲۸۷ھ (اقتباس بہ شکریہ ڈاکٹر اکبر حیدری)
۵۵۔	"محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف" (جلد دوم)	ڈاکٹر اسلم فرخی، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی ۱۹۶۵ء
۵۶۔	"مراثی انیس" (جلد اول):	مرتبہ سید علی حیدر نظم طباطبائی۔ نظامی پریس، بدایوں طبع دوم ۱۹۳۵ء
۵۷۔	"مراثی انیس" (جلد دوم):	مرتبہ سید علی حیدر نظم طباطبائی، نظامی پریس، بدایوں، طبع دوم ۱۹۳۶ء
۵۸۔	"مراثی انیس" (جلد سوم):	مرتبہ سید علی حیدر نظم طباطبائی۔ نظامی پریس، بدایوں، طبع اول ۱۹۳۰ء
۵۹۔	"مراثی میر انیس مرحوم" (جلد دوم):	مطبع تیج کمار، لکھنؤ، آٹھواں ایڈیشن ۱۹۵۸ء
۶۰۔	"مراثی میر انیس مرحوم" (جلد چہارم):	مطبع تیج کمار لکھنؤ۔ ساتواں ایڈیشن ۱۹۵۸ء
۶۱۔	"مرثیہ خوانی کا فن":	نیر مسعود، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۹۰ء
۶۲۔	"مرثیہ مرزا دبیر مرحوم" (جلد اول):	مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۹۳۷ء

۶۳۔	"مرثیہ میر مونس" (جلد اول):	نول کشور پریس، لکھنؤ، طبع دوم ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء
۶۴۔	"مرثیہ ہائے میر انیس مرحوم" (جلد پنجم):	مطبع دبدبہ احمدی، لکھنؤ۔ بہ فرمائش سید عبدالحسین
۶۵۔	"مرثیہ ہائے میر انیس مرحوم" (جلد ششم جدید):	مطبع شاہی لکھنؤ۔ بہ فرمائش سید عبدالحسین جون ۱۹۱۳ء
۶۶۔	"مرزا دبیر سیتاپور میں" (مضمون):	ناوم سیتاپوری، رسالہ "ماہ نو" راولپنڈی، دبیر نمبر، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء
۶۷۔	"مرزا سودا کے تنقیدی مراسلات":	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن۔ ادارہ تصنیف، علیگڑھ ۱۹۶۱ء
۶۸۔	"مرگ انیس" (مضمون):	قاضی عبدالودود، مجلہ "معاصر" پٹنہ شمارہ ۱
۶۹۔	"مرگ دبیر" (مضمون):	قاضی عبدالودود۔ مجلہ "معاصر" پٹنہ۔ شمارہ ۱
۷۰۔	مرگ دبیر کی خبر:	اخبار "نور الانوار"، کانپور جلد ۵ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۰ مارچ ۱۸۷۵ء (اقتباس بہ شکریہ ڈاکٹر اکبر حیدری)
۷۱۔	مکتوب سید آغا حسین ارسطو جاہی:	بہ نام سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ مورخہ ۹ جون ۱۹۴۳ء، ذخیرہ ادیب۔ لکھنؤ
۷۲۔	مکتوب سید آغا حسین ارسطو جاہی:	بہ نام سید مسعود حسن رضوی ادیب، مورخہ ۱۹ جون ۱۹۴۳ء، ذخیرہ ادیب، لکھنؤ
۷۳۔	مکتوب سید آغا حسین ارسطو جاہی:	بہ نام سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ از جھنگ ۱۹۵۹ء (؟) ذخیرہ ادیب، لکھنؤ
۷۴۔	مکتوب صفدر آہ سیتاپوری:	بہ نام نیر مسعود۔ مورخہ ۲۵ فروری ۱۹۷۸ء
۷۵۔	مکتوب صفدر آہ سیتاپوری:	بہ نام نیر مسعود۔ مورخہ ۱۱ اپریل ۱۹۷۸ء
۷۶۔	مکتوب صفدر آہ سیتاپوری:	بہ نام نیر مسعود۔ مورخہ ۲۱ اپریل ۱۹۷۸ء
۷۷۔	مکتوب میر نواب مونس:	بہ نام حکیم سید علی دولی پوری۔ نقل ذخیرہ ادیب
۷۸۔	مکتوب نجیب حسین:	بہ نام مدیر "رثائی ادب"، کراچی۔ نصف صدی نمبر، جولائی، ستمبر ۱۹۹۷ء

۷۹۔	"ملک اختر":	واجد علی شاہ اختر، مطبع سلطانی، کلکتہ، رمضان ۱۲۹۱ھ
۸۰۔	"موازنۂ انیس و دبیر":	شبلی نعمانی (طبع اول، مفید عام پریس، آگرہ، ۱۹۰۷ء کا عکسی ایڈیشن)، اترپردیش اردو اکادمی۔ لکھنؤ ۱۹۸۲
۸۱۔	"میر انیس اور مرزا دبیر کا بنارس میں پہلی مرتبہ ورود" (مضمون):	مولوی باقر حسین جونپوری، اخبار "طریقت"، جون پور، یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء
۸۲۔	"میر انیس کا سفرِ دکن" (مضمون):	سید آغا حسین ارسطو جاہی، ماہنامہ "ہمایوں" لاہور۔ نومبر ۱۹۳۰ء
۸۳۔	"میر انیس مغفور" (مضمون):	نوبت رائے نظر لکھنوی۔ ماہنامہ "زمانہ"، کان پور، اکتوبر ۱۹۰۸ء
۸۴۔	"میر مونس اور حیاتِ دبیر":	سید محمد عبدالرسول شاکی۔ مطبوعہ محمود سٹ پبلشنگ ہاؤس، لکھنؤ ۱۹۳۱ء
۸۵۔	"نو اور مرزا دبیر" (مضمون):	نیر مسعود، سہ ماہی "اردو"، کراچی، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۰ء
۸۶۔	"نوائے وطن":	سید علی محمد شاد عظیم آبادی۔ مطبع قیصری، عظیم آباد
۸۷۔	"واقعاتِ انیس":	سید مہدی حسن احسن لکھنوی۔ اصح المطابع، لکھنؤ (۵ مارچ ۱۹۰۸ء کے بعد)
۸۸۔	"وضع دارانِ لکھنؤ" (حصہ اول):	سید محمد ہادی لکھنوی۔ تصویرِ عالم پریس۔ لکھنؤ ۱۹۰۸ء
۸۹۔	"حیاتِ دبیر پر ایک نظر":	سید حسین رضوی میرٹھی۔ مفید عام پریس، لکھنؤ ۱۹۱۳
۹۰۔	"مجموعہ قلمی سلام ہائے انیس و خاندانِ انیس":	(عطیہ سید علی احمد دانش)

(اخبارات، رسائل)

۱۔	"اردو"، کراچی، جولائی، ستمبر ۱۹۹۰ء	(دیکھیے ۸۵)
۲۔	"اودھ اخبار"، لکھنؤ، ۱۳ اپریل ۱۸۷۰ء	دیکھیے (۵۴)
۳۔	"رثائی ادب"، کراچی، اپریل جون ۱۹۹۷ء	(دیکھیے ۵۲)
۴۔	"رثائی ادب"، کراچی، جولائی، ستمبر ۱۹۹۷ء	(دیکھیے ۷۸)
۵۔	"زمانہ"، کان پور اکتوبر ۱۹۰۸ء	(دیکھیے ۸۳)
۶۔	"طریقت"، جون پور یکم اکتوبر ۱۹۳۳ء	(دیکھیے ۸۱)
۷۔	"ماہ نو"، راولپنڈی ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء	(دیکھیے ۶۶)
۸۔	"معاصر"، پٹنہ شمارہ ۱	(دیکھیے ۶۸_۶۹)
۹۔	"معاصر"، پٹنہ شمارہ ۱۸	(دیکھیے ۳۶)
۱۰۔	"نورالانوار"، کان پور ۳۰ مارچ ۱۸۷۵ء	(دیکھیے ۷۰)
۱۱۔	"ہمایوں"، لاہور نومبر ۱۹۳۰ء	(دیکھیے ۸۲)

اشاریه

(الف)

(د، ڈ)

☆☆☆☆☆

مرثیے اور رثائیات کے

جملہ تنقیدی، تحقیقی اور شعری اظہار پر مشتمل

اردو دنیا کا

منفرد خالصتاً سہ ماہی ادبی جریدہ

رثائی ادب

۱۹۹۶ء سے کراچی سے شائع ہو رہا ہے

محمدی ایجوکیشن اینڈ پبلی کیشن کراچی